(کہانیوں کا مجموعہ)

از

ڈاکٹر منصور احمد اعجازی

(کہانیوں کا مجموعہ)

از

ڈاکٹر منصور احمد اعجازی

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل
کمیٹی حکومت اترپردیش، لکھنؤ کے
مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

نام کتاب ________ اچھوت خون

سال اشاعت ________ ٢٠٠٦ء

تعداد طباعت ________ ٤٠٠ سو آفسیٹ

مطبع ________ کراؤن آفسیٹ سبزی باغ پٹنہ ٤

ناشر ________ ڈاکٹر منصور احمد اعجازی

زرِ تعاون ________ پچاس روپے =/Rs. 50

اس کتاب میں سبھی واقعات اور کردار فرضی ہیں حقیقی افراد یا واقعات سے مطابقت محض اتفاقیہ ہے جس کے لئے مصنف یا ناشر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

انتساب

والد محترم ڈاکٹر مغفور احمد اعجازیؒ

اور

والدہ ماجدہ عزیز الفاطمہ اعجازیؒ

کے نام!

مصنّف کے احوال واقعی

نام ـــــ (ڈاکٹر) منصور احمد اعجازی

والدین ـــــ ڈاکٹر مغفور احمد اعجازیؒ و

عزیز الفاطمہ اعجازیؒ

سکونت ـــــ اعجازی ہاؤس، ڈاکٹر اعجازی مارگ، مظفر پور، بہار

آبائی سکونت ـــــ موضع اعجازی نگر، ڈیہولی تھانہ سکرہ ضلع مظفر پور

تعلیمی استعداد ـــــ ایم۔ ایس۔ سی (ریاضیات)، پی ایچ۔ ڈی (ریاضیات)

پیشہ ـــــ ڈپٹی کلکٹر، حال انڈر سکریٹری محکمہ، شہری ترقیات حکومت بہار۔

دیگر تصنیف ـــــ وسیلہ (کہانیوں کا مجموعہ)

برادران ـــــ اصغر حسین اعجازی، ایڈوکیٹ و صحافی

و مقبول احمد اعجازی، ایڈوکیٹ و پروفیسر لاء کالج

ہمشیران ـــــ ذکیہ اعجازی، رضیہ اعجازی، شمیمہ اعجازی

شریک حیات ـــــ شہناز پروین اعجازی

فہرست

۱ اونچ نیچ ـــــ ۸
۲ اچھوت خون ـــــ ۱۱
۳ نیا شوالہ ـــــ ۱۴
۴ باجی ـــــ ۱۶
۵ سبق ـــــ ۱۹
۶ دولت کا اندھا ـــــ ۲۲
۷ پشیمانی ـــــ ۲۴
۸ صبح کا بھولا ـــــ ۲۶
۹ بھلا برائی ـــــ ۳۰
۱۰ چچا ڈن ـــــ ۳۳
۱۱ حق ـــــ ۳۵
۱۲ بہار ـــــ ۳۸
۱۳ اندھ وشواس ـــــ ۴۰
۱۴ پرایا خون ـــــ ۴۴
۱۵ جیسی کرنی ویسی بھرنی ۴۸
۱۶ کرنی کا پھل ـــــ ۵۱
۱۷ خدا کا امتحان ـــــ ۵۴
۱۸ نوکر ـــــ ۵۷
۱۹ سورگ ـــــ ۶۰
۲۰ آئیڈیل ـــــ ۶۵
۲۱ اصلی نقلی ـــــ ۷۱
۲۲ سراب ـــــ ۷۵
۲۳ شیر دلوتا ـــــ ۸۰
۲۴ مرجھاتی کلی ـــــ ۸۹

افسانچے

۱ حادثہ ـــــ ۹۲
۲ چور ـــــ ۹۵
۳ شادی ـــــ ۹۷
۴ بھائی ـــــ ۱۰۰

پیش لفظ

میری پہلی کاوش اصلاحی کہانیوں کا مجموعہ "وسیلہ" جو کہ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کی مالی تعاون سے شائع ہوئی، کی مقبولیت کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسری اصلاحی کہانیوں کا مجموعہ "اچھوت خون" قارئین کی عدالت میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ زیر نظر کتاب میں سماج کے مختلف رشتوں کے درمیان پھیلی بداعتمادی، نفرت، اور برائیوں کو اجاگر کرتے ہوئے اس میں اصلاح کی تلقین کی گئی ہے۔ ساتھ ساتھ طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہے۔ اس مشینی دور میں لمبی کہانیاں پڑھنے کی فرصت کم مل پاتی ہے اس لئے عام ڈگر سے ہٹ کر مختصر کہانیوں میں ہی کہانی کا مقصد بیان کرتے ہوئے اس کی اصلاح پیش کی گئی ہے۔ اگر میری کتاب معاشرہ میں پھیلی ان برائیوں کے اصلاح میں کچھ بھی کام آسکا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت کامیاب ہوئی۔ امید ہے کہ قارئین اس کتاب کو پسند فرمائیں گے۔ مجھے ان کے تبصروں کا انتظار رہے گا۔

مصنف

اونچ نیچ

شہر کے جانے مانے رئیس خان بہادر سید سراج الدین کی اکلوتی بیٹی وسیمہ کی آج شادی ہونے والی تھی۔ فلک نما سراج منزل دلہن کی طرح سجائی گئی تھی۔ گھر میں مہمان کھچا کھچ بھرے تھے۔ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھتی ہے۔ بوائے فون اٹھاتا ہے۔ خان بہادر کے لئے فون ہے۔ کارڈلیس پر خان بہادر مخاطب ہوتے ہیں۔ ہیلو! ادھر ان کے ہونیوالے سمدھی سید حمید ہیں جو بڑے غصہ میں بول رہے ہیں خان بہادر! دھوکہ دینے کے لئے ایک میں ہی رہ گیا تھا۔ تم اپنی لیوکیوزدہ بیٹی کو میرے اکلوتے بیٹے کے پلّے باندھنا چاہتے ہو یہ تو شکر ہے کہ مجھے بر وقت خبر مل گئی۔ آج بارات نہیں آئے گی اپنی بیٹی کو کنواری بٹھائے رکھو عمر بھر۔ تم نے سمجھا تھا کہ پیسہ کے بل پر میرے چاند سے بیٹا کو خرید لو گے ...... ادھر سے اور نہ جانے کیا کیا بھلا برا کہا گیا۔ فون خان بہادر کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر جاتا ہے۔ وہ پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں۔ فون بوائے دوڑ کر پانی لاتا ہے بیگم صاحبہ کو خبر ملتی ہے تو انہیں غش آ جاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا گھر ماتم کدہ بن جاتا ہے۔ اب شہر کے مدعوئین کے آنے کا وقت ہو رہا تھا جن میں امیر رؤسا کے علاوہ بڑے بڑے افسران بھی شامل تھے۔ خان بہادر کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ رہے ہیں کہ آج خاندان کی عزت مٹی میں مل جائے گی بیٹی کی بارات نہیں آئے گی۔ کل کو وہ منھ دکھانے کے قابل نہیں رہ جائیں گے۔ مہمانوں

میں بھی یہ خبر پھیل گئی۔ اور چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ جتنی منھ اتنی ہی باتیں۔ ادھر وسیمہ کا روتے روتے برا حال تھا۔

خان بہادر نے بہت سوچ بچار کر اپنے بھائی سید معراج الدین سے انکے لڑکے کا ہاتھ مانگا مگر وہ مکر گئے۔ اپنی سالی سے فریاد کیا تو وہ کبھی اپنے شوہر پہ ٹال گئیں اپنی بہن سے بھانجہ کا ہاتھ مانگا تو وہ آج کے دور کا رونا رونے لگیں کہ وہ پولیو زدہ لڑکی سے شادی کرنے کو تیار نہیں ہے۔ میں تو پہلے ہی اپنی بھتیجی کا ہاتھ مانگنا چاہتی تھی۔

اپنوں سے مایوس ہونے کے بعد وہ فیصلہ کن لہجہ میں شوفر سے گاڑی نکالنے کو کہتے ہیں اور اپنے بچپن کے دوست جنید کے گھر روانہ ہو جاتے ہیں۔ راستہ میں پچھلی سبھی باتیں فلم کی طرح ان کے دماغ میں گھومنے لگتی ہیں۔ جنید نیچے ذات کا غریب آدمی تھا جنید اور وہ مدرسہ میں ساتھ پڑھتے تھے بعد میں جنید نے پڑھائی چھوڑ دی اور چھوٹا موٹا دھندہ کرنے لگا۔ خان بہادر اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر چلے گئے۔ ان دونوں میں پھر ملاقات نہیں ہو سکی۔ جنید کا ایک بیٹا تھا جاوید۔ جنید نے محنت و مشقت کر کے اسے اعلیٰ تعلیم دلایا۔ وہ سبھی امتحانات اول درجہ سے پاس کرتا ہوا کالج میں وسیمہ کے ساتھ پڑھنے لگا۔ دونوں میں کافی دوستی تھی۔ دھیرے دھیرے یہ دوستی پیار میں تبدیل ہو گئی۔ اس کا آنا جانا سراج منزل میں ہونے لگا۔ وہ ایک خوبرو اور ہونہار نوجوان تھا۔ وسیمہ کے والدین بھی اسے چاہنے لگے۔ جب جاوید ایم، اے کے امتحان میں اول آیا تو خان بہادر نے فیصلہ کیا کہ دونوں کی شادی کر کے اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت بھیج دیں گے۔ ایک روز خان بہادر نے جاوید سے کہا کہ وہ لوگ اس کے والدین سے اس کا ہاتھ اپنی بیٹی کے لئے مانگنے شام میں اس کے گھر آئیں گے۔ جاوید یہ جان کر بڑا خوش ہوا۔ اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا۔ شام میں جب خان بہادر اپنی بیگم کے ساتھ جاوید کے گھر پہونچے تو جنید نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ خان بہادر نے دیکھتے ہی جنید کو پہچان لیا۔

اوران کا آنکھ بھوں سکڑنے لگا۔ جاوید نے دونوں کا تعارف کرایا مگر خان بہادر تو غصہ سے تمتما رہے تھے۔ جنید پر برس پڑے...... "تمہارے بیٹے کو ہمت کیسے ہوئی کہ میری بیٹی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔ اپنے اوقات میں رہو، شادی برابر والوں میں ہوتی ہے۔ ایک نیچ ذات کے لڑکے نے یہ کیسے جرأت کی کہ سیّد کی لڑکی بیاہ لائے" وہ واپس ہونے لگے تو جنید نے بڑی التجا کی کہ جاوید کی غلطی کے لئے اسے معاف کر دیں اور بچپن کی دوستی کے ناطے کم سے کم چائے تو پیتا جائے۔ لیکن خان بہادر تو غصہ سے آگ بگولا ہو رہے تھے۔ جنید کی بیوی ہاتھ میں ناشتہ کا ٹرے لئے سہمی کھڑی تھی۔ انہوں نے ناشتہ کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا کہ چائے پیئے میری جوتی اور وہاں سے مع اپنی بیگم کے روانہ ہو گئے...... اچانک گاڑی کو بریک لگی۔ جنید کا گھر آگیا تھا۔ خان بہادر اپنے خیالوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں واپس آگئے۔

جنید کو دیکھتے ہی خان بہادر نے اس کے پاؤں پر اپنی ٹوپی اتار کر رکھدی اور روتے ہوئے بولے جنید میرے دوست! میرے بھائی! اب میری اور میرے خاندان کی عزت تمہارے ہاتھ ہے۔ میری بیٹی کی بارات آج آنے والی تھی مگر لڑکے والے کو معلوم ہو گیا کہ اس کا ایک پاؤں پولیو زدہ ہے اور نقلی ٹانگ لگائی گئی ہے جس کے سہارے وہ چلتی ہے وسیمہ کو اپنی بہو بنا لو۔ میری پچھلی غلطیوں کو معاف کر دو۔ میں اپنے کئے پر شرمندہ ہوں۔ جنید نے خان بہادر کی ٹوپی اٹھا کر ان کے سر پہ رکھدی اور کہا کہ میرے دوست وسیمہ میری بھی بیٹی ہے تم اطمینان سے گھر جاؤ اور بارات کے استقبال کی تیاری کرو خان بہادر کے گھر واپس ہوتے ہی خوشیوں کی لہر دوڑ گئی۔ شہنائی بجنے لگی۔ شام میں جنید بڑی دھوم دھام سے اپنے بیٹے جاوید کی بارات لے کر سراج منزل پہونچا۔ رخصتی کے وقت دونوں سمدھی گلے مل کر خوب روئے اور ان کے آنسوؤں میں اونچ نیچ کی جھوٹی دیوار ڈھ گئی۔

——— ۔ہ۔ ———

اچھوت خون

ٹھاکر صاحب کی حویلی میں کہرام مچا تھا۔ ان کے اکلوتے جوان بیٹے کنور جی شہر جاتے وقت سڑک حادثہ میں بری طرح زخمی ہو کر اسپتال میں داخل تھے۔ ٹھاکر ٹھکرائن گاڑی پر سوار ہو کر شہر پہونچے۔ ساتھ میں پرانے خادم جگو کو بھی لے لیا۔ اسپتال پہونچ کر معلوم ہوا کہ کنور جی کا کافی خون نکل چکا ہے۔ اگر فوری طور پر خون نہیں چڑھایا گیا تو ان کا بچنا مشکل ہو جائے گا۔ ٹھاکر، ٹھکرائن کے خون کی جانچ کی گئی مگر وہ کنور جی کے خون سے نہیں ملا۔ بلڈ بینک میں نگیٹیو گروپ کا خون موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے جگو کے خون کا جانچ کیا تو وہ مل گیا۔ اگر اور کوئی موقع ہوتا تو شاید ٹھاکر صاحب اس کے ہاتھ کا پانی بھی نہیں پیتے۔ مگر یہاں اکلوتے بیٹے کی زندگی کا سوال تھا۔ مجبوراً ٹھاکر صاحب نے جگو سے خون دینے کو کہا۔ مگر اس نے صاف منع کر دیا۔ وہ بولا! مالک! اچھوت کا خون ٹھاکر کو کیسے چڑھے گا؟ جگو دور جا کر بیٹھ گیا۔ ٹھاکر ٹھکرائن پریشان ہو کر ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ جگو نے آنکھیں موند لیں۔ اسے پرانی باتیں یاد آنے لگیں۔ ٹھاکر صاحب کے گھر پر کیرتن تھا۔ گاؤں کے سبھی لوگ جمع تھے۔ کیرتن کے بعد جب پرساد بانٹنے کا وقت آیا تو جگو کا اکلوتا بیٹا رموا جس کی عمر مشکل سے آٹھ نو سال تھی، دوڑ کر پرساد کے تھال سے اور بچوں کے ساتھ لڈو اٹھا کر کھانے لگا۔ کنور جی یہ دیکھ کر آگ ببولا ہو اٹھے اور انہوں

نے ایسا طراق رموا کو مارا کہ وہ لڑھکتا ہوا زینہ سے نیچے چلا گیا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور خون تیزی سے بہنے لگا۔ گاؤں کے ڈاکٹر نے شہر لے جانے کی صلاح دی۔ بیل گاڑی سے شہر لے جاتے وقت راستے ہی میں اسکی موت واقع ہو گئی۔ وہ من ہی من میں بڑبڑا اٹھتا ہے" رموا کے خونی کو خون نہیں دوں گا مرتا ہے تو مر جائے" آہٹ پر آنکھ کھولتا ہے تو جگو کے سامنے ٹھاکر ٹھکرائن ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں۔ ٹھاکر صاحب کہتے ہیں جگو میرے بیٹے کی جان بچاؤ تمہیں منھ مانگا انعام دوں گا زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا۔ جگو کانپتے ہوئے آواز میں بولتا ہے۔ مالک! کیا آپ انعام میں میرے مرے ہوئے رموا کو زندہ دے سکتے ہیں ٹھاکر صاحب شرمندہ ہوتے ہوئے کہتے ہیں جگو مردہ کبھی زندہ ہوا ہے؟ تم پچھلی باتوں کو بھول جاؤ اور اس غلطی کو معاف کر دو۔ کنور تمہارے بیٹے کی طرح ہیں ان کی جان بچا لو۔ یہ سننا تھا کہ جگو کو رموا کا مرتا ہوا چہرہ یاد آتا ہے۔ اس کی ماں چھاتی پیٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگر کنور مر گئے تو ٹھکرائن بھی اسی طرح کلیجہ پیٹے گی۔ وہ کانپ جاتا ہے۔ اس کی جذبۂ ہمدردی اور انسانیت عود آتی ہے۔ وہ چلا اٹھتا ہے .... میں خون دوں گا .... میں کنور کو خون دوں گا .... کنور کو مرنے نہیں دوں گا۔ ٹھاکر صاحب جگو کو گلے لگا لیتے ہیں۔

جگو کا اچھوت خون کنور کے رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ وہ روبہ صحت ہو جاتے ہیں۔ سبھی گاؤں واپس لوٹتے ہیں۔ کنور جی کی صحت یابی کی خوشی میں کرتن کا انتظام کیا گیا جس میں گاؤں کے سبھی لوگ مدعو کئے گئے ہیں۔ کرتن کے بعد ٹھاکر صاحب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور گرجدار آواز میں اعلان کرتے ہیں .... اونچی اور نیچی ذات کچھ نہیں ہوتا۔ اچھوت اور سورن سب انسان کا بنایا ہوا ہے۔ بھگوان نے سبھی کو انسان بنایا ہے۔ سبھی کا خون ایک ہے۔ کوئی خون اچھوت نہیں ہوتا ہے۔

یہ سب انسانی دماغ کا خرافات ہے۔ آج سے اس گاؤں میں کوئی چھوا چھوت نہیں
مانے گا۔ کوئی اونچا نیچا نہیں رہے گا۔ یہ میرا حکم ہے۔ اچھوت مندر میں جائیں گے۔ سوَرنوں
کے کنوؤں سے پانی لیں گے۔ سبھی سماجی کاموں میں برابر کے شریک رہیں گے۔ کوئی بھی
آدمی اس کی حکم عدولی نہیں کرے گا۔ ورنہ اس کو گاؤں سے نکال دیا جائے گا۔

سب لوگ ایک آواز سے نعرہ بلند کرتے ہیں ٹھاکر صاحب کی جئے۔ ٹھاکر
صاحب سب کو چپ کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری جئے مت بولو۔ اگر جئے بولنا ہی ہے
تو جگو کا بولو۔ جس نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے راستہ دکھایا۔ وہ زور سے بولتے
ہیں جگ موہن کی جئے۔ اور سبھی اس کے ساتھ نعرہ لگاتے ہیں۔ جگو سبھی کو پرساد بانٹتا ہے۔

—— ٠ ——

نیا شوالہ

اکلو میاں ٹھیکیدار اور سیٹھ مول چند کی دوستی کا چرچا سارے شہر میں تھا۔ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ مول چند کے یہاں کوئی اُتسو ہوتا تو اکلو میاں پیش پیش رہتے اگر اکلو میاں کے یہاں کوئی تقریب ہوتی تو مول چند آگے آگے نظر آتے۔ ایک دوسرے پر کوئی مصیبت آتی تو دونوں خاندان مل بانٹ کر جھیلتے۔ دونوں کا مکان بھی آمنے سامنے تھا۔ اکلو میاں حج کو جانے لگے تو اسٹیشن پر مول چند اور اس کے گھر والے بھی اس کو چھوڑنے گئے۔ گاڑی کھلتے وقت دونوں دوست گلے مل کر خوب روئے۔ اکلو میاں نے مول چند سے کہا یار! گھر کو خدا اور تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ مول چند نے کہا خدا نگہبان ہے دوست! میں جان پر کھیل کر بھی اس کی نگہبانی کروں گا۔

وقت گزرتا رہا۔ اکلو میاں کے واپسی کا وقت قریب آتا ہے۔ سب خوشی خوشی اس کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اسی بیچ اچانک کسی چھوٹی موٹی بات پر شہر میں بلوہ ہو جاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر اس کے گھیرے میں آجاتا ہے۔ چاروں طرف مارکاٹ شروع ہو جاتی ہے۔ انسان، انسان کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے۔ ہر طرف آگ کے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ اللہ اکبر اور بجرنگ بلی کے نعروں سے شہر گونج اٹھتا ہے۔ بلوائی اکلو میاں کے محلہ میں گھس آتے ہیں۔ جب وہ لوگ اکلو میاں کے

دروازہ پر پہونچتے ہیں تو وہاں مول چند لاٹھی لئے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ بلوائی مول چند کو دیکھکر آگ بگولہ ہو اٹھتے ہیں وہ مول چند کو دھکا دیکر آگے گھسنا چاہتے ہیں تو مول چند راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور ان لوگوں سے مخاطب ہوکر کہتا ہے جب تک میں زندہ ہوں تم لوگ اندر نہیں گھس سکتے۔ اس کے لئے تمہیں میری لاش پر سے گذرنا ہوگا۔ بلوائی نعرہ لگاتے ہیں۔ مول چند غدار ہے مارو سالے کو۔ سب مول چند پر ٹوٹ پڑتے ہیں مول چند اکیلے ان سب کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ مگر تن تنہا کب تک ان سب کا مقابلہ کرتا۔ زخموں سے نڈھال ہوکر زمین پر گر کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اندر سے اکلو میاں کی بیوی اور بچے سانس روکے یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ اتنے ہی میں پولس کے سائرن کی آواز آتی ہے۔ بلوائی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ مول چند کو اسپتال لے جایا جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے حالات معمول پر آجاتے ہیں مول چند اسپتال سے صحت یاب ہوکر گھر واپس آجاتا ہے۔ اکلو میاں حج سے واپس آئے۔ مول چند اور ان کے گھر والے اس کا اسٹیشن پر استقبال کرتے ہیں۔ اکلو ٹرین سے وارد ہوتا ہے۔ دونوں دوست گلے مل کر روتے ہیں۔ مول چند دوست سے کہتے ہیں یار اکلو! تمہاری امانت تمہیں واپس سونپ رہا ہوں۔ میرا کام ختم ہوا۔ اکلو میاں اس کے منھ پر ہاتھ رکھکر کہتے ہیں میرے دوست مول چند! کام ابھی ختم کہاں ہوا؟۔ دونوں دوستوں کو مل کر اب کام شروع کرنا ہے۔ ایک نیا شوالہ بنانا ہے ؎

آ ایک نیا شوالہ اس دلیش میں بنا دیں
بچھڑوں کو پھر ملادیں نقش دوئی مٹا دیں

———— -٠- ————

باجی

خلیق اور زبیدہ کی شادی کو بارہ سال بیت گئے۔ لیکن وہ لوگ اب تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ ہر طرح کا علاج کرایا، درگاہ اور خانقاہ کا چکر لگایا۔ پیر، فقیر کے یہاں دوڑیں لگائیں مگر مشیئت ایزدی کے آگے کسی کی چلی ہے وہ لوگ اولاد کے لئے ترستے ہی رہے۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ زبیدہ کو یہ فکر ستا رہی تھی کہ ان لوگوں کے بعد کیا ہوگا؟ کوئی نام لیوا نہیں رہ جائے گا۔ کوئی فاتحہ پڑھنے والا نہیں ہوگا۔ خلیق اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کے بعد خاندان کا چراغ گل ہو جائے گا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر خلیق کو دوسری شادی کرنے کی صلاح دی۔ مگر وہ راضی نہ ہوا۔ وہ زبیدہ سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس کے لئے سوتن لانا اس کو گوارہ نہ تھا۔ لیکن زبیدہ بھلا کہاں ماننے والی تھی۔ اس نے رونا دھونا شروع کر دیا اور کھانا پینا ترک کر دیا۔ زبیدہ کے ضد اور دباؤ میں آکر وہ دوسری شادی کے لئے آمادہ ہو گیا۔ زبیدہ اپنی پسند سے خالدہ کو اپنی سوتن بیاہ کر لائی۔ خود اپنے ہاتھوں سے اس کا حجلۂ عروسی سجایا۔ اسے گھر کا کوئی کام نہیں کرنے دیتی اسے چھوٹی بہن کی طرح پیار کرتی۔ کچھ دنوں تک خالدہ نے بھی زبیدہ کو باجی باجی کہہ کر عزت کی۔ مگر دھیرے دھیرے پاس پڑوس کے لوگوں نے کان بھرنا شروع کر دیا۔

تو اس کے دماغ میں کیڑا رینگنے لگا۔ اسے یہ بات ناگوار گزرنے لگی کہ پورے گھر میں زبیدہ کا راج تھا۔ سب لوگ اسے ہی پوچھتے، خواہ نوکر چاکر ہوں یا ملنے جلنے والے۔ چاہے رشتہ دار، خلیق بھی ہر بات اسی سے پوچھ کر کرتا۔ دھیرے دھیرے خالدہ نے گھر کے انتظام میں دخل اندازی شروع کر دی۔ اور سارے گھر پر قبضہ کر لیا۔ زبیدہ سیدھی سادی نیک دل خاتون تھی۔ اس نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اور اپنے کمرہ تک محدود ہو گئی۔ مگر خالدہ اس پر بھی باز نہیں آئی۔ اس نے نوکرانی کو نکال دیا۔ اب گھر کا سارا کام زبیدہ کے سر پر آ گیا۔ صبح سے رات تک اسے گھر کا سارا کام کرنا پڑتا۔ چکی کی طرح سارا دن پستی رہتی۔ خلیق چاہ کر بھی کچھ نہیں بول پاتا۔

وقت گزرتا گیا، چھ سال بیت گئے۔ خالدہ کی گود ہری نہ ہوئی۔ شوہر سے اپنے بھتیجہ کو گود لینے کو کہا۔ مگر وہ راضی نہ ہوا۔ اس کا ماننا تھا کہ اگر خدا کو منظور نہیں ہے تو دوسرے کے بچے کو گود لینے سے کیا حاصل۔ اسی کشمکش کے دوران قدرت خداوندی سے زبیدہ کے پاؤں بھاری ہو گئے۔ خلیق یہ جان کر خوشی سے پاگل ہو اٹھا زبیدہ کو ہر کام کرنے سے منع کر دیا۔ اب گھر کا سارا کام خالدہ کے سر آ گیا۔ اللہ اللہ کر کے وہ دن بھی آیا جب خلیق اور زبیدہ کی برسوں کی آرزو پوری ہوئی اور زبیدہ ایک پھول سے بچے کی ماں بنیں۔ مسجد میں چراغاں کیا گیا مزاروں اور درگاہوں میں نذرانہ بھیجا گیا۔

جب سب کاموں سے فراغت ملا تو زبیدہ کو خالدہ کی یاد آئی اسے تلاش کیا تو دیکھا کہ فرش صاف کر رہی ہے گھر میں نوکرانی نہیں رہنے کی وجہ کر اور زبیدہ کی زچگی کو لے کر گھر کا کام بڑھ گیا تھا۔ خلیق سے اس نے نوکرانی کے لئے کہا بھی تھا، مگر اس نے منع کر دیا کہ تم نے ہی تو نوکرانی کو ہٹا دیا۔ جب اتنے دنوں تک زبیدہ نے اکیلے سب کام کیا ہے تو کچھ دنوں تک تم نہیں کر سکتیں۔ زبیدہ کو یہ دیکھ کر

برداشت نہ ہوا۔ اس کا فطری جذبہ انسانیت اور رحم دلی عود آیا۔ اس نے خالدہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا کہ میری پیاری بہن تم اس کام کے لئے نہیں ہو۔ ہم دونوں مل کر اپنے بیٹے کی پرورش کریں گے۔ گھر کے کام کے لئے نوکرانی پھر سے رکھ لیں گے۔ خالدہ کو اپنے رویہ کی یاد آئی۔ اور زبیدہ کا برتاؤ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گیا اور وہ زبیدہ سے باجی کہہ کر لپٹ گئی۔ زبیدہ اس کے پیٹھ پہ ہاتھ رکھ کر اس کو دلاسہ دینے لگی۔ خلیق دور کھڑا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور قدرت خداوندی پر حیران تھا۔

سبق

سلیم اور فہیم دو پڑوسی تھے۔ سلیم ایک نیک دل اور خدا ترس آدمی تھا
اپنے کام سے کام رکھتا، ہمیشہ دوسروں کا بھلا چاہتا تھا۔ محلہ میں کسی کو کوئی ضرورت
ہوئی تو اس کے پاس جاتا، وہ حتیٰ الامکان سب کی مدد کرتا تھا۔ لوگ اس کی بڑی
عزت کرتے تھے۔ محلہ میں وہ سلیم سردار کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کے برعکس فہیم
بہت چالباز اور تیز طرار قسم کا آدمی تھا۔ ہمیشہ دوسروں کو نقصان پہونچانے کی کوشش
میں رہتا تھا۔ کسی کو بھلا ہوتا دیکھنا اس کو گوارہ نہیں تھا۔ سلیم سے تو اور بھی حسد کرتا
تھا۔ سلیم کی لڑکی بالغ تھی۔ جب بھی کوئی لڑکا والا آتا وہ اس کو بہکا دیا کرتا تھا۔ سلیم
بہت پریشان رہتا تھا۔ مگر اس نے کبھی بھی اس کی شکایت فہیم سے نہیں کی۔ اسے خدا پر
پورا بھروسہ تھا۔ فہیم کے لاکھ جتن کرنے پر بھی سلیم کی لڑکی کی شادی طئے ہوگئی اور اللہ
اللہ کرکے انجام بھی پا گئی۔

ہمیشہ دوسروں کی ٹوہ لینے والا شخص فہیم کو اپنا گھر دیکھنے کی فرصت ہی نہیں
تھی۔ اس کی بیٹی جوان ہورہی تھی مگر اسے ذرہ برابر فکر نہ تھا۔ لڑکی کو پوری چھوٹ دے
رکھی تھی۔ بے جا آزادی رنگ لائی اور اس کی بیٹی حاملہ ہوگئی جب اس کی جانکاری
فہیم کو ملی تو وہ بہت آگ ببولا ہوا۔ بیٹی کو مار پیٹ کیا مگر اس سے کیا حاصل تھا۔ جو ہونا

تھا سو ہو چکا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب اس کے خاندان کی ناک کٹنے والی تھی۔ ساری عزت خاک میں مل جاتی۔ بھید کھل جاتا تو کوئی لڑکا شادی نہ کرتا۔ شروع میں ان لوگوں کو پتہ نہ چلا۔ اب اتنی دیر ہو چکی تھی کہ اسقاط سے بیٹی کے جان کو خطرہ تھا۔

اب کوئی راستہ نہ دیکھ کر فہیم کو اپنے پڑوسی سلیم سردار کی یاد آئی۔ رات کے وقت وہ منھ چھپائے سلیم کے گھر پہونچا۔ سلیم نے فہیم کو آتے دیکھا تو بہت تعجب ہوا۔ کہ آج سورج پچھم سے کیسے اُگ آیا؟ اس نے بہت محبت اور اخلاق سے فہیم کو بٹھایا۔ حال چال پوچھا۔ فہیم نے روتے ہوئے ساری روداد سنائی۔ اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ سلیم نے بہت غور وخوض کیا اس کے بعد اندر جاکر اپنی بیوی سے بات کی۔ پھر اس کے چہرہ پر اطمینان کی جھلک آگئی باہر آکر اس نے فہیم سے کہا۔ بھائی فہیم! اب خوش ہو جاؤ تردد مت کرو۔ جائے ناشتہ کرو۔ اللہ نے تمہاری پریشانی دور کردی۔ تمہاری لڑکی کی شادی ہو جائے گی۔ اور ساری الجھنیں دور ہو جائیں گی۔ فہیم نے کہا بھلا ایسی حالت میں کون لڑکا میری لڑکی سے شادی کرنا پسند کرے گا۔ اگر شادی کسی طرح سے ڈھک چھپا کر کر بھی دی جاتی ہے تو اس کے بعد سچائی جان کر اس کو چھوڑ دے گا۔ سلیم نے کہا نہیں میرے بھائی ایسا نہیں ہوگا۔ تم مطمئن رہو، لڑکا کوئی اور نہیں میرا بیٹا نسیم ہے۔ میں سب جان کر شادی کر رہا ہوں۔ فہیم نے سلیم کا پاؤں پکڑ لیا۔ اور معافی مانگنے لگا۔

اس نے کہا میں نے ہمیشہ تمہاری برائی کی۔ مگر تم اس برائی کے بدلہ اتنی بڑی بھلائی کر رہے ہو جو شاید اپنا سگا بھائی بھی نہیں کرتا۔ میں اس کے بدلہ میں کیا کر سکتا ہوں؟

سلیم نے کہا تمہاری بیٹی ہماری بیٹی ہے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ خدا نے مجھے سب کچھ دیا ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ تم بدلہ میں صرف یہ کرو کہ آج سے تمام بری

عادتیں ترک کردو۔ خدا سے لَو لگاؤ اور لوگوں کے ساتھ بھلائی کرو۔ کسی کا بُرا مت چاہو۔ فہیم نے کان پکڑ کر کہا میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے نیک انسان بن جاؤں گا۔ کبھی کسی کی برائی نہیں کروں گا۔ حتی الامکان سب کی مدد کروں گا۔ فہیم اور سلیم سمدھی بن گئے اور سلیم کے اس سبق نے فہیم کو ایک نیک انسان بنا دیا۔

دَولت کا اندھا

موہن اور سوہن بچپن کے دوست تھے۔ ایک ساتھ پاٹھ شالا جاتے تھے۔ ایک ساتھ ہی ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ پھر کالج میں داخلہ لیا۔ دونوں نے کالج سے فراغت پانے کے بعد اپنا اپنا تجارت شروع کیا۔ موہن کا قسمت نے ساتھ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے موہن ترقی کرتا ہوا شہر کا سب سے بڑا تاجر بن گیا۔ مگر سوہن کا قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ اس نے کپڑے کا کاروبار شروع کیا مگر دکان چل نہ سکی۔ اس پر شومیٔ قسمت یہ کہ دکان میں شارٹ سرکٹ سے آگ لگ گئی۔ اور سارا اثاثہ جل کر خاکستر ہو گیا۔ سوہن پیسہ پیسہ کو محتاج ہو گیا۔ ادھر سے بازار کا قرض اور گھر کا خرچ الگ۔ اتنی رقم بازار سے اگر لیتا تو سود بہت زیادہ ہو رہا تھا۔ بینک والے رہن کے لئے اثاثہ کھوج رہے تھے۔ اس کی بیوی نے رائے دی کہ اپنے بچپن کے دوست موہن سے مدد لے۔ وہ ایک دن موہن کے یہاں جا پہونچا۔ موہن بہت خندہ پیشانی سے ملا۔ چائے ناشتہ کرایا، پوچھا کیسے یاد کیا؟ سوہن نے اپنی پوری روداد سنائی اور آخر میں نے اس نے بطور قرض مدد کی درخواست کی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ حالات سدھرتے ہی قرض لوٹا دے گا۔ مگر موہن نے بڑی زمیت سے اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا۔ اور بتایا کہ ابھی اس کا ہاتھ خالی ہے۔ اگر اس کے پاس ہوتا تو وہ اپنے بچپن

کے دوست کی ضرور مدد کرتا۔ سوہن کو بڑا دھکا لگا وہ بڑی امیدیں لے کر آیا تھا۔ وہ مایوس ہو کر خالی ہاتھ لوٹ گیا۔

گھر واپس آکر بیوی کو ساری باتیں بتائیں۔ بیوی نے دلاسا دیا۔ آپ نہ گھبرائیں میرا زیور ہے اسے بیچ دیں قرض داروں کا کچھ کچھ قرض دے کر ادھار مال لے کر پھر سے بزنس شروع کریں۔ موہن نے کچھ نانکر کے بعد بیوی کی تجویز مان لی۔ اور زیور فروخت کر کے قرضداروں کو کچھ دیکر نئے سرے سے بزنس شروع کیا۔ قسمت نے اس کا ساتھ دیا۔ اس کا بزنس چمک اٹھا دیکھتے ہی دیکھتے وہ شہر کا سب سے بڑا کپڑوں کا تاجر بن گیا۔

ادھر موہن کے بزنس میں اچانک مندی آگئی۔ اس کا جہاز مال لاتے وقت ڈوب گیا۔ شیئرز میں گھاٹا ہوا۔ اونے پونے بیچنا پڑا۔ نتیجہ دلوالیہ پن تک پہونچ گیا۔ وہ قرض میں ڈوب گیا ایک وقت میں شہر کا سب سے بڑا آدمی دانہ دانہ کو محتاج ہو گیا۔

ایسے وقت میں اسے اپنے دوست سوہن کی یاد آئی۔ مگر اس کے ساتھ کئے برتاؤ سے وہ شرمندہ تھا۔ اس وقت دولت کی چکا چوند نے اسے اندھا بنا دیا تھا۔ اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ہمت جٹا کر وہ سوہن کے پاس جا پہونچا۔ سوہن بڑے تپاک سے ملا۔ بڑی خاطر مدارت کی۔ موہن نے اسے اپنی آپ بیتی سنائی اور اس سے مدد کی التجا کی تاکہ وہ پھر سے اپنا بزنس کھڑا کر سکے۔ سوہن نے تپاک سے کہا بھائی موہن مدد کیسی اور کیسا قرض؟ سب تمہارا ہے جتنا چاہو لے لو۔ اس نے پورے خلوص کے ساتھ تن من دھن سے موہن کی مدد کی۔ موہن کے حالات پھر سے سدھر گئے۔ اس کا بزنس جمنے لگا۔ اب اگر کوئی بھی دوست یا ضرورت مند اس کے پاس مدد کے لئے آتا تو وہ سب چھوڑ کر حتی الامکان ہر طرح سے اس کی مدد کرتا۔

پشیمانی

بشیر کی بیوی کا انتقال ہوا تو اس کا صرف ایک بچہ تھا شمیر۔ وہ ابھی مشکل سے چار پانچ سال کا تھا بار بار اپنی ماں کو تلاش کرتا تھا۔ بشیر اس کو کھلونے ٹافی وغیرہ سے بہلا دیتا تھا کہ اس کی ماں اللہ میاں کے یہاں گئی ہے۔ اس کے لئے بہت سے کھلونے اور مٹھائیاں لانے۔ بچہ بہل جاتا تھا مگر روز روز اس کو بہلانا مشکل ہو گیا تھا۔ ایک دن اس نے بشیر سے سوال کر دیا۔ ماں آخر کب آئے گی؟ اگر وہ نہیں آتی ہے تو دوسری ماں لادو۔ بشیر کے منھ سے بے ساختہ نکل گیا کیا تم دوسری ماں کو پیار کرو گے؟ اس نے کہا ہاں ضرور۔ اس کے بعد تو اس نے ضد پکڑ لی کہ دوسری ماں لادو۔ گھر والوں کا دباؤ الگ تھا۔ آخر اس نے سمجھ دیکھ کر شکیلہ سے دوسری شادی کر لی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ ایسی لڑکی سے شادی کرے جو شمیر کو ماں کا پیار دے۔ اس وعدہ وعید کے بعد یہ شادی انجام پائی تھی۔ شمیر تو اپنی نئی ماں کو دیکھکر پھولے نہیں سمایا۔ شکیلہ نے بھی شوہر کا دل جیتنے کے لئے اس کو خوب پیار دیا۔ مگر جب اس کی اپنی بچی پیدا ہوئی تو آہستہ آہستہ شکیلہ کے پیار میں کمی آنے لگی۔ بعد میں چل کر شمیر سے سوتیلی ماں سا برتاؤ شروع کر دیا۔ بشیر کے سامنے تو کچھ دکھاوا کرتی مگر اس کے پیچھے میں اس سے بُرا سلوک کرتی۔ گھر کا سارا کام کرواتی۔ چھوٹی چھوٹی بات پر مار پیٹ معمول بن گیا تھا۔ مگر شمیر اپنی ماں کی طرح

اس کو پیار کرتا تھا اور بہن کو بھی کافی لاڈ پیار کیا کرتا۔ اس کو ماں کے رویہ پر کبھی کبھی تعجب ہوتا تھا دھیرے دھیرے بشیر پر شکیلہ کا رویہ ظاہر ہو گیا۔ اس نے شمیر کو بورڈنگ اسکول میں داخل کرانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے دوسری شادی پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔

شام کی گاڑی سے شمیر کو نینی تال جانا تھا۔ وہیں بورڈنگ اسکول میں اس کا داخلہ ہونا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا، سب لوگ سو گئے تھے، کافی گرمی پڑ رہی تھی۔ مگر شمیر کو نیند نہیں آرہی تھی اسے گھر، ماں باپ اور بہن کے چھوٹنے کا ملال تھا۔ آنکھیں بند کئے کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک کھٹ کے آواز سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ نظریں گھما کر دیکھا تو ایک زہریلا سانپ اس کی ماں کے لٹکتے ہوئے بستر سے چڑھ کر ماں کی طرف بڑھ رہا تھا اس کی دم سے گلاس کو ٹھوکر لگی تھی جس سے کھٹ کی آواز ہوئی تھی۔ شمیر نے جھٹ پاس پڑی لاٹھی اٹھا لیا اور نشانہ لگا کر ایسا مارا کہ وہ سانپ کو جا لگا۔ اور وہ نیچے گر کر تڑپنے لگا۔ لاٹھی کی آواز پر اس کے ماں باپ اٹھ گئے۔ شکیلہ نے پہلے تو سمجھا کہ شمیر نے اس پر حملہ کیا تھا اور ابھی بھی لاٹھی اس کے ہاتھ میں دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ مگر جب نیچے تڑپتے ہوئے سانپ کو دیکھا اور شمیر نے پورا واقعہ بتایا تو سب ماجرا سمجھ میں آگیا۔ بشیر نے مار مار کر سانپ کو کچومر کر دیا۔ اور شکیلہ شمیر سے لپٹ کر اس کو پیار کرنے لگی۔ روتے ہوئے اس نے کہا میرے لال! میرے جگر کے ٹکڑے میں تجھے بورڈنگ نہیں جانے دونگی۔ تم یہیں پڑھو گے۔ بشیر یہ سنکر اور بیوی میں انقلابی تبدیلی دیکھکر خدا کی درگاہ میں سجدہ ریز ہو گیا۔ اسے دوسری شادی کی پشیمانی دور ہو گئی۔

-۰-

صبح کا بھولا

سنیتا گھر کی بڑی بہو تھی۔ بہت شوق و ارمان سے بیاہ کر لائی گئی تھی۔ اس کے ماں باپ نے بھی اپنی اوقات سے بڑھکر مالک جہیز دیا تھا۔ سسرال میں اس کا بہت مان تھا۔ ساس سسر والدین کی طرح مانتے تھے۔ نند دیور بھی لاڈ پیار میں لگے رہتے۔ شوہر سنیل کا تو کیا کہنا؟ وہ تو واری فدا تھا۔ ہمیشہ ناز برداری میں لگا رہتا۔ سنیتا اپنی قسمت پر بہت نازاں تھی۔ وہ بھی سسرال والوں کی بھرپور خدمت کرتی اور سبھوں پر جان نچھاور کرنے کو تیار رہتی۔ میکے والوں کو خط لکھتی تو سسرال والوں کے تعریف کا پل باندھ دیتی تھی۔ میکے والے خط پڑھکر خوش ہوتے تھے کہ بیٹی آرام سے ہے وقت ہنسی خوشی گذر رہا تھا۔ نند سنیلہ کی شادی طئے ہو گئی، گھر میں چہل پہل بڑھ گیا ایک دن اس کی ساس نے بہت ہچکچاتے ہوئے کہا کہ ایک لاکھ روپے سنیلا کی شادی میں کم پڑ رہا ہے وہ بطور قرض اپنے پتا سے منگوا دے۔ جو شادی کے بعد انتظام کر کے دیدیں گے۔ سنیتا نے بخوشی میکے والوں کو خط لکھا اس کے باپ نے فوری طور پر روپیوں کا انتظام کر کے سنیتا کے بھائی کے معرفت روپیہ بھیج دیا اور خط لکھا کہ سمدھی جی چنتا نہ کریں گے شادی کے بعد اطمینان سے واپس کریں گے سنیتا کی جو ساس نے دیکھا کہ ایک خط پر اتنی آسانی سے ایک لاکھ روپیہ آگیا تو گویا شیر کے منھ میں خون لگ گیا۔

اب ہر کچھ دنوں پر کسی نہ کسی بہانے کچھ فرمائش ہوتی۔ سنیتا خط لکھتی اور اس کے ماں باپ کسی طرح روپیوں کا انتظام کر کے بھیجتے رہتے۔ کبھی ساس کے علاج کے لئے کبھی سسر کے تیرتھ کے لئے۔ کبھی شوہر کو دفتر جانے میں دقت تھی تو اسکوٹر کے لئے۔ یہ لامتناہی سلسلہ جو چل رہا تھا سنیتا کو اب شرم آتی تھی۔ اس طرح بار بار خط لکھ کر میکے سے روپیہ منگوانا اسے ناگوار لگنے لگا۔ اب دیور جی انیل کی نوکری کے لئے ۲۵ ہزار روپے کی ضرورت آن پڑی تو ساس نے پھر فرمائش کر دی۔ سنیتا نے دبے لفظوں سے کہا پتاجی اب ریٹائر کر گئے ہیں پہلے ہی وہ بہت بھیج چکے ہیں ایک لاکھ روپیہ جو انہوں نے سنیلا کی شادی پر دیا وہ اب تک باقی ہے۔ انہیں دو بیٹیوں کی شادی کرنی ہے۔ اب ان سے اور مانگنے میں مجھے شرم آتی ہے میرا زیور ہے اس کو بیچ کر انیل کو رقم دے دیجئے۔ یہ سننا تھا کہ ساس آگ ببولا ہو گئیں۔ بولیں تمہارے باپ نے ایک لاکھ روپے دیکر کیا احسان کیا ہے قرض ہی تو ہے انتظام ہوتے ہی اتار دیں گے۔ کسی طرح پچیس ہزار روپے میکے سے منگواؤ۔ زیور اس گھر کا ہے نہیں بکے گا۔ سنیتا نے جو یہ سنا تو سکتے میں آگئی۔ اسے ساس سے ایسے رویّہ کی امید نہیں تھی۔ اس نے بھی اپنے میکے سے روپیہ لانے سے صاف انکار کر دیا۔ اور خط لکھنے سے بھی منع کر دیا۔ ساس نے زبردستی خط لکھوانا چاہا مگر وہ نہ مانی۔ اس پر غصہ پر آکر ساس نے ایسا دھکا مارا کہ مسہری کے کونے پر اس کا سر لگا اور پھٹ گیا۔ وہ فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ نوکرانی نے ہوش دلایا اور مرہم پٹی کیا۔ شوہر کے رویّہ میں بھی تبدیلی آگئی۔ دفتر سے آنے پر سر پر پٹی بندھا دیکھ کر بھی یہ تک پوچھنا گوارہ نہ کیا کہ کیا ہوا ہے؟ الٹا ماں کی بات سن کر بولا کہ ماں کہہ رہی تھی تو خط لکھ دیتی۔ ہرج ہی کیا تھا؟ مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ شوہر نے بھی تاؤ میں آکر پٹائی کر دی۔ اب مار پیٹ اور گالی گلوج روز کا معمول بن گیا۔ مگر سنیتا بھی اپنی بات پر اٹل تھی۔ اپنے میکے سے روپیہ نہیں منگوائے گی اور ہر ظلم و ستم برداشت کرتی رہے گی۔ خواہ وہ مر ہی کیوں نہ جائے۔ لیکن وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آئی، سبھی

کی خدمت اسی لگن سے کرتی رہی۔

ایک دن صبح سنیتا کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ گھر میں ہنگامہ برپا ہے سنیلا کے سسرال والوں نے اسے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا تھا کہ میکے سے کار لے کر واپس آنا ورنہ اس گھر میں کبھی مت آنا۔ سنیتا اپنے کمرہ سے باہر آئی تو سنیلا بھابی کو دیکھ کر اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔ سنیتا نے اسے چپ کرایا اور کہا کہ صبر کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

شام میں سنیتا صرافہ بازار گئی اپنے تمام زیورات کو بیچ ڈالا۔ اور اس رقم سے ایک موٹر کار خریدا ایک ڈرائیور ٹھیک کیا اور گھر لوٹ آئی۔ شوہر سے بولی کہ کل دفتر سے چھٹی لے لو۔ صبح سویرے اپنے شوہر کے ساتھ سنیلا کو لیا اور اس کے سسرال کار سے روانہ ہوئی۔ اس کے سسرال والے انگشت بدنداں تھے وہ سنیلا کے سسرال پہونچی۔ سسرال کے لوگوں نے شرمندگی اور خوف کے ملے جلے ماحول میں ان لوگوں کا استقبال کیا۔ سنیلا کے شوہر کو گاڑی کی چابی تھماتے ہوئے سنیتا نے کہا جیجا جی! یہ لیجئے گاڑی کی چابی۔ آپ کی پہلی فرمائش تھی سو ہم لوگوں نے پوری کر دی۔ بیوی اردھانگنی ہوتی ہے۔ پیسہ کمانے کی مشین نہیں۔ اسے پیسہ کمانے کا ذریعہ مت بنایئے۔ کمائی تو آپ اس سے طوائف بنا کر بھی کرا سکتے ہیں۔ اپنے دست بازو پر بھروسہ کیجئے اور اسی سے اپنا شوق پورا کیجئے۔ آپ کی پہلی ضد ہم لوگوں نے پوری کر دی ہے۔ اگر دوبارہ یہ حرکت کی تو آپ سبھی لوگ حوالات میں نظر آئیں گے۔ سنیلا کے شوہر نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ بھابی آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اب میں کان پکڑتا ہوں کہ دوبارہ میں کوئی فرمائش نہیں کروں گا۔ سنیلا کو بھی پوری عزت اور محبت سے رکھوں گا۔ اس نے سنیلا سے بھی معافی مانگی۔

سنیتا جب سنیلا کے یہاں سے واپس اپنے سسرال پہونچی تو وہاں کا ماحول بدلا ہوا پایا۔ ساس نے گلے لگالیا۔ اور سسر سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ سسر بولے! بیٹی ہم لوگوں کی غلطی معاف کر دو۔ تم نے ہم لوگوں کو راستہ دکھایا ہے۔ ہم لوگ بھٹک گئے

تھے۔ جو کام مجھے کرنا چاہیے تھا وہ تم نے کیا ہے۔ اب ہم لوگ کبھی بھی تمہارے جہیز کا کوئی مانگ نہیں کریں گے۔ شوہر نے بھی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ سنیتا نے کہا کہ صبح کا بھولا اگر شام میں واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ آپ لوگ ہمارے بزرگ ہیں۔ ماتا، پتا سمان ہیں۔ پتی تو دیوتا ہیں۔ میری جگہ ان کے چرنوں میں ہے۔ میرے لئے اس سے خوشی کی بات اور کیا ہوگی کہ آپ لوگ ٹھیک راستہ پر واپس آگئے اور میرا سوُرگ مجھے واپس مل گیا

سنیتا کے سسر نے اپنی آبائی جائیداد میں سے کچھ بیچ کر انیل کو رقم دیدی بہو کا بکا ہوا زیور لاکر اسے واپس کر دیا۔ اور بولے کہ بیٹی یہ تمہاری امانت ہے۔ جو تمہارے ماتا پتا نے تمھیں دیا ہے۔ تمہیں مبارک ہو تمہارے پتا سے جو ایک لاکھ روپیہ قرض سنیلا کی شادی پر لیا تھا اس کا ڈرافٹ بھی آج ہی انہیں بھیج رہا ہوں ساتھ میں دیری کیلئے معافی بھی مانگ لوں گا۔ سنیتا کے سسر کا بھیجا ہوا ڈرافٹ اس کے باپ نے اپنے داماد سنیل کو واپس بھیج دیا کہ وہ ان روپیوں سے کار خرید لے تاکہ دفتر آنے جانے میں آسانی ہو۔

---۰---

بھلا بُرائی

عاصم کے دو بیٹے تھے کاظم اور ناظم ۔ اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ عاصم کھاتا پیتا آدمی تھا۔ کپڑے کی چھوٹی سی دکان تھی اسی سے ہنسی خوشی گزارا ہو جاتا تھا۔ بڑے بیٹے کاظم کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کے ایک بچہ بھی تھا۔ بڑھاپے کی وجہ کر اس نے کاظم کو دکان پر بٹھانا شروع کر دیا تھا۔ ناظم بہت ہونہار تھا۔ اس نے ہائی اسکول اول درجہ سے پاس کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لے لیا تھا جبکہ کاظم مڈل تک ہی پڑھ سکا تھا۔ باپ نے بہت کوشش کی مگر پڑھنے میں اس کی طبیعت نہیں لگی۔ تب اسے دکان پر بٹھا دیا تھا۔ ایک دن اچانک عاصم کو دل کا دورہ پڑا اور اس کا انتقال ہو گیا۔

باپ کے مرنے کے بعد کاظم نے ناظم کی پڑھائی چھوڑا دی۔ اور دکان پر بٹھا دیا۔ اب ناظم کو صبح سویرے بھوکے پیاسے دکان پر جانا پڑتا اور دیر رات تک دکان بند کر کے واپس آنا پڑتا۔ نہ تو کاظم اور نہ ہی اس کی بیوی اس کے کھانے پینے کا دھیان رکھتی۔ نتیجتاً وہ بیمار پڑ گیا۔ دکان نہیں جا سکا۔ کاظم کی بیوی نے جھوٹی شکایت اس سے کی کہ ناظم بیماری کا بہانہ بنا کر دکان نہیں گیا ہے۔ کاظم نے بجائے سچائی دریافت کرنے کے بیوی کی بات میں آکر ناظم کو گھر سے نکال دیا۔ ناظم آنکھ میں آنسو

لئے گھر سے چل دیا اس کے پاس صرف ایک گھڑی تھی۔ جو اس کے باپ نے اس کو میٹرک پاس کرنے پر دی تھی اسے بیچ کر اس نے اپنے لئے دوالی اور کلکتہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہونچکر اس نے پرانے موٹر پارٹس کی ایک دکان میں نوکری کر لی۔ اس کی محنت اور لگن سے مالک کو بہت منافع ہوا۔ مالک نے خوش ہو کر اسے پرانے موٹر پارٹس کی ایک چھوٹی سی دکان دلا دی۔ اور پرانی گاڑیاں خریدنے میں حصہ دار بنا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کافی ترقی کر لی۔ اور ایک بڑا بیوپاری بن گیا اس نے اپنے آبائی شہر مظفر پور میں بھی بڑی سی دکان کھول لی۔ کوٹھی نما مکان بنا لیا۔ ایک بڑے گھرانہ میں شادی بھی رچالی۔ ناظم بہت نیک دل اور فیاض تھا۔ وہ غریبوں اور ضرورتمندوں کی مدد بے جھجک کرتا تھا۔ مظفر پور میں بھی حاجت مندوں اور غریبوں کی اس کے مکان پر بھیڑ جمع رہتی۔ کوئی مایوس یا خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تھا۔ ضرورت مند یہ معلوم کرتے رہتے کہ شیخ ناظم یا شیخ صاحب جس نام سے وہ مشہور تھا، کب آ رہے ہیں۔ وہ جب تک مظفر پور میں رہتا اس کے مکان پر ایک میلہ لگا رہتا۔ وہ غریبوں اور حاجت مندوں کی جتنی زیادہ امداد کرتا اتنا زیادہ اس کا کاروبار ترقی کرتا رہا۔ اس کا کاروبار پورے ملک میں پھیل گیا۔ اس نے مظفر پور میں رہنے کا دن مقرر کر دیا تھا ان دنوں میں لوگ دور دور سے مدد کی امید میں اس کے گھر پر پہونچ جاتے اور وہ خود سے سبھی کو امداد دیتا۔ لوگوں کی پریشانیاں پوچھتا انہیں دلاسہ دیتا۔

ایک دن صبح سویرے وہ اپنے مظفر پور والی کوٹھی سے اپنی امپالا کار سے باہر نکل رہا تھا۔ تو گیٹ پر دیکھا کہ کوئی عورت بچے کو لئے کھڑی ہے۔ دربان اسے بتا رہا تھا کہ آج کے دن شیخ صاحب نہیں ملتے ہیں جس دن امداد تقسیم ہوتا ہے اسی دن آنا۔ ناظم نے گاڑی رکوا دی، دربان سے پوچھا کیا بات ہے؟ دربان نے بتایا کہ کوئی مصیبت زدہ عورت ہے امداد کے لئے آئی ہے۔ اس نے بتا دیا کہ آج امداد

نہیں ملے گا جس دن تقسیم ہوتا ہے اسی دن آنا۔ ناظم نے پرس سے کچھ رقم نکال کر دربان کو دیا کہ اس عورت کو دیدے۔ وہ عورت جب امداد لے کر اس کو دعائیں دینے لگی تو اس کے چہرہ پہ ناظم کی نظر پڑ گئی وہ عورت کوئی اور نہیں اس کی اپنی بھابی تھی۔ وہ گاڑی رکوا کر جھٹ اترا، بھابی اور بچے کو کوٹھی کے اندر لے گیا۔ پوری حالات سنے۔ بھابی نے بتایا کہ اس کے آنے کے بعد کاظم کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ دکان کی پونجی تک ختم ہوگئی۔ کچھ دنوں تک قرضوں پہ کام چلا۔ اس کے بعد لوگوں سے مدد لے کر کام چلاتی ہے۔ شیخ صاحب کا نام سنکر یہاں آئی تھی یہ سب سن کر ناظم کی آنکھوں میں آنسو آگیا۔ بھابی کو دلاسہ دیا۔ فوراً گاڑی سے جاکر کاظم کو ایک اچھے نرسنگ ہوم میں داخل کرا دیا۔ کاظم جب نرسنگ ہوم سے صحت یاب ہو کر لوٹا تو پونجی لگا کر آبائی دکان کو پھر سے چالو کرا دیا۔ اس کے حالات سدھر گئے۔ کاظم بڑا شرمندہ تھا۔ ایک دن اس نے اپنے چھوٹے بھائی سے معافی مانگتے ہوئے کہا ناظم مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں گھر سے نکال دیا اور تم نے اس برائی کے بدلہ میرے ساتھ یہ سلوک کیا کہ مجھے اپنے گھر لے آئے میری مدد کی جبکہ تمہیں منھ پھیر لینا چاہیے تھا۔ تم نے میری بدسلوکی کا بدلہ اپنے حسن سلوک سے دیا ہے میں بہت شرمندہ ہوں مجھے معاف کر دو۔ ناظم نے کہا بھیّا! آپ نے میری برائی نہیں بھلائی کی۔ اگر آپ نے مجھے گھر سے نہیں نکالا ہوتا تو شاید میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اور آج میری حالت اچھی نہ رہتی تو آپ کی بھی مدد نہیں کر سکتا تھا اس لئے آپ نے انجانے میں میری بھلائی کی جو مجھے گھر سے نکال دیا۔ یہ بھلا برائی تھا جو آپ نے میرے ساتھ کیا اور ہم لوگوں کے لئے نیک فال ثابت ہوا۔

چچا لڈن

سویرے بستر سے اٹھا ہی تھا کہ دیکھتے ہیں۔ چچا لڈن نازل ہیں مگر چچا کا حلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ نہ وہ پا ئجامہ کرتا۔ اور نہ ہاتھ میں تھیلا۔ بلکہ وہ سفاری سوٹ میں ملبوس تھے۔ اور ہاتھ میں خوبصورت بریف کیس تھا۔ انوکھی مسکراہٹ ہونٹوں پر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی تپاک سے ملے اور بولے۔ ارے ڈپٹی صاحب ابھی بستر پر ہی ہیں۔ دیکھیئے میں یارپور سے سیدھے ملنے چلا آیا ہوں۔ کیونکہ ابھی بلائے میں دیر تھی۔ میں سمجھ نہیں سکا تو میں نے پوچھا کہ چچا یارپور کون سا گاؤں ہے۔ اور آپ پر کون سی بلا آنے والی ہے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی کہ نہ تو یارپور کوئی گاؤں ہے اور نہ ہی مجھ پر کوئی بلا آنے والی ہے۔ ارے میں ہوائی اڈہ سے آرہا ہوں ہوائی جہاز اڑنے میں ابھی دیر تھی۔ سو آپ سے ملنے چلا آیا۔ تب میں سمجھا کہ چچا ایرپورٹ کو یارپور اور فلائٹ کو بلائے کہہ رہے ہیں۔ میں من ہی من میں مسکرا کر رہ گیا۔ میں نے کہا چچا آپ بیٹھے میں تیار ہو کر آیا ناشتہ ہم لوگ ساتھ کریں گے۔ چچا نے کہا آپ تیار ہو کر آئیں میں صرف چائے پر آپ کا ساتھ دوں گا۔ بکواس تو میں ہوائی اڈہ سے کر کے آیا ہوں۔ چچا بریک فاسٹ (ناشتہ) کو بکواس کہہ رہے تھے۔ میں مسکراتا ہوا جلدی سے باتھ روم میں گھس گیا۔ تیار ہو کر ناشتے کے میز پر آیا اور چچا کو بھی اصرار کر کے بلایا۔ ایک دو ٹوسٹ

لیتے ہوئے بولے موا اس ٹھوس وٹر سے تو میرا پیٹ ہی نہیں بھرتا ہے۔ میں نے تو چچا بی بھاجی ناشتہ کیا ہے انکے ہاتھ میں ٹوسٹ دیکھکر سمجھ گیا کہ چچا ٹوسٹ بٹر (مکھن) کو ٹھوس وٹر کہہ رہے ہیں میرا تجسس بڑھ رہا تھا کہ چچا نے وضع قطع کیوں بدل لیا اور ہوائی جہاز سے کہاں جا رہے ہیں میں نے پوچھا چچا آپ ہوائی جہاز سے کہاں جا رہے ہیں؟ اور یہ وضع قطع کیوں بدل لیا ہے؟ چچا نے پورا واقعہ بتاتے ہوئے کہا میرا لڑکا جمن جسے آپ جانتے ہیں امریکہ میں رہتا ہے وہیں اس نے اپنی پسند سے ولایتی لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ اس نے بہو سے ملنے کے لئے مجھے بلایا ہے۔ لکھا تھا کہ قاعدے سے آئیں گے ایسا نہ ہو کہ بہو گنوار سمجھ لے اس لئے وضع قطع بدلنا پڑا ہے میں نے کہا چچا آپ تو ایسی شادیوں کے مخالف تھے تو پھر ولایتی بہو کو کیسے قبول کرلیا۔ وہ افسردہ لہجہ میں بولے۔ ڈپٹی صاحب کیا کروں لڑکا بالغ ہے اور اوپری دیہہ بھی ہے اس لئے برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ اوپری دیہہ میرے گلے میں نہیں پڑا۔ میں نے چچا سے وضاحت چاہی۔ چچا بولے اوپری دیہہ نہیں سمجھتے آپ بھی تو اوپری دیہہ ہیں۔ یعنی ترقی یافتہ۔ تب میں نے سمجھا کہ چچا اپٹوڈیٹ کو اوپری دیہہ کہہ رہے ہیں۔ میرے منھ سے ہنسی نکل رہی تھی مگر اس کو روکتے ہوئے میں نے چچا سے پوچھا کہ آپ کی فلائٹ کتنے بجے ہے؟ وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولے ڈپٹی صاحب گپ میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ ٹیم (ٹائم) تو ہو گیا ہے۔ اچھا تو چلتا ہوں گو دبائی (GOD BYE) بریف کیس اٹھایا اور چچا تیزی سے چلے گئے۔ میں سمجھ گیا کہ چچا نے گڈ بائی (GOOD BYE) کا حجامت بنا دیا ہے۔ اور میں نے بھی زور سے کہا گڈ بائی چچا۔ امریکہ سے واپسی پر ملنے ضرور آئیے گا۔ خدا حافظ۔

حق

اچانک سویرے سویرے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ ٹھاکر ہنیری لے کر آئے ہیں۔ دھان کٹوا رہے ہیں سال بھر کی محنت پر پانی پھر رہا تھا۔ کسانوں کے بچوں کے منھ کا ہار چھینا جا رہا تھا۔ سب نوجوان کسان ہاتھوں میں لاٹھی لئے کھیتوں کی طرف دوڑ پڑے۔ پچھلے سال کی طرح اس سال بھی جب فصل تیار ہوا اور کاٹنے کا وقت آیا تو ٹھاکر صاحب ہنیری اور غنڈے لے کر فصل کٹوانے پہونچ گئے تھے۔ کھیتوں کے آر پر چاروں طرف سے غنڈے بندوق، رائفل اور لاٹھی بھالا سے لیس ہو کر پہرہ دے رہے تھے۔ اور ٹھاکر صاحب کے آدمی دھان کاٹ رہے تھے۔ کسانوں کو دیکھکر وہ لوگ اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگے۔ کسان رائفل اور بندوق دیکھکر ٹھٹھک سے گئے۔ پشتہا پشت سے کسان ٹھاکر صاحب کے آبا و اجداد کی زمین بٹائی پر کرتے آئے تھے۔ سال بھر خون پسینہ ایک کر کے وہ محنت کرتے، کھیتوں کو جوت کوڑ کرتے۔ بیج پانی اور کھاد ڈالتے۔ فصل تیار ہونے پر کاٹ کر ٹھاکر صاحب کا مقررہ حصہ ان کو پہونچا دیتے۔ ٹھاکر جگل کستور کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے منگل کستور ٹھاکر بنے تو ان کی نیت خراب ہو گئی۔ پچھلے سال انہوں نے بزور بازو ساری فصل کٹوا کر ہڑپ کر لی۔ کسانوں کو ایک دانہ نہیں دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ کسانوں کے قبضہ سے زمین چھڑا لیں لیکن

وہ اپنی روزی روٹی کے ذریعہ کو کیسے چھوڑ دیتے۔ یہی زمین تو ان کی ماں تھی۔ جس سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرتے تھے۔ کسانوں نے بہت سی عرضیاں دیں۔ تھانہ پولس کیا۔ مگر ان کی فریاد کون سنتا۔ ہر جگہ ٹھاکر صاحب کی پہونچ تھی۔ کسانوں کی آواز نقارخانہ میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی۔

بلّو میٹرک کا امتحان دے کر شہر سے آیا تھا اسے جب ساری بات معلوم ہوئی تو اس نے نوجوانوں کو اکٹھا کیا اور سب کو تلقین کی کہ اس بار ہم لوگ دب گئے تو ہمیشہ یہ ظلم برداشت کرنا ہوگا یا ہمارا کھیت چھن جائے گا۔ ہمارے بچے بھوکے مریں گے۔ اس بار فیصلہ کرلینا ہے بوڑھوں نے کچھ سمجھانے کی کوشش بھی کی۔ ٹھاکر صاحب سے لڑنے سے فائدہ کیا ہے؟ یہ تو ہمارا مقدر بن چکا ہے۔ مگر بلّو کے جوش و خروش کے آگے بوڑھوں کی ایک نہ چلی۔ سبھی نوجوان بلّو کے پیچھے ہو لئے۔

بلّو نے غنڈوں کو دیکھ کر ایک زوردار نعرہ لگایا۔ انقلاب زندہ باد۔ سبھی نے بلّو کا ساتھ دیا۔ بلّو نے ٹھاکر صاحب سے ہاتھ جوڑ کر بنتی کی۔ ٹھاکر صاحب! آپ ہمارے مائی باپ ہیں۔ ہم سال بھر محنت کرتے ہیں پھر آپ ہمارے منھ کا ہار کیوں چھین رہے ہیں؟ ہم برسہا برس سے کھیتی کرتے آئے ہیں جو آپ کا حصہ ہوتا ہے وہ ہم لوگ دیوڑھی پر پہنچا دیں گے۔ مگر ٹھاکر صاحب کو اس سے صبر کہاں تھا۔ وہ تو پورا کا پورا ہضم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بلّو اور دوسرے نوجوانوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا ہٹ جاؤ ورنہ مارے جاؤگے۔ بلو اور نوجوانوں کا خون بھی گرم تھا۔ ان کی سال بھر کی کمائی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ ایک نوجوان کارتک جوش میں آکر کھیت کی طرف دوڑ پڑا۔ اور ٹھاکر صاحب کے ایک آدمی سے ہنسوا چھین کر دھان کاٹنے لگا۔ ٹھاکر صاحب کے اشارہ پر گولی چلی تھائیں۔ گولی کارتک کے پاؤں میں لگی اور وہ خون سے لت پت ہو کر وہیں گر پڑا۔ بلّو نے جو یہ سماں دیکھا تو زور سے چلّایا۔ بھائیوں! گولی سے مت ڈرو۔ اس بار نہیں تو کبھی نہیں۔

فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے۔ ٹھاکر کے غنڈوں سے مت ڈرو۔ جیت تمہاری ہو گی۔
انقلاب زندہ باد۔ اور سب نوجوان نعرہ لگاتے ہوئے اپنی اپنی لاٹھیاں لیئے ٹھاکر
صاحب کے غنڈوں پر ٹوٹ پڑے۔ نعرہ بازی سن کر گاؤں سے بوڑھے، بچے اور
عورتیں موسل، کلہاڑی اور لاٹھی غرض کہ جس کو جو ملا لیکر کھیتوں کی طرف دوڑ پڑے۔
غنڈے بھیڑ کو دیکھکر گھبرا گئے ٹھاکر صاحب کے کہنے پر بھی کہ گولی چلاؤ میں دیکھ لوں گا
ان لوگوں نے گولی نہیں چلائی اور وہ بھاگ چلے۔ ٹھاکر صاحب نے جب اپنے
لوگوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر حویلی چلے گئے۔ کسانوں
نے خوشی کا نعرہ لگایا سب نے بلّو کو کندھوں پر اٹھالیا اور اس کا زندہ باد کرنے
لگے۔ کسانوں نے خوشی خوشی فصل کی کٹائی شروع کر دیا۔ فصل کٹائی کے بعد
جشن منایا گیا جس میں بلّو کو بستی کا سردار چنا گیا۔ بلّو نے سبھی کو نصیحت کرتے ہوئے
کہا کہ اپنا حق مانگنے سے نہیں ملتا چھیننا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی جینے کے لئے مرنا بھی پڑتا ہے۔
کارتک نے، جو صحت یاب ہو کر اسپتال سے لوٹ آیا تھا زور کا نعرہ لگایا۔ بلّو بھیا!
اور سب نے ایک آواز سے کہا زندہ باد۔

---۰---

بہار

سیٹھ میوا لال کی مل میں آج تالا بندی ہو گئی پچھلے چھ ماہ سے اپنی مختلف مانگوں کو لے کر مل مزدوروں نے ہڑتال کر رکھی تھی سیٹھ میوا لال کے مل میں اعلیٰ قسم کے سوتی کپڑے تیار ہوتے تھے جو بیرونی ممالک میں بھی برآمد کیا جاتا تھا۔ میوا لال مل کا بڑا نام تھا۔ مگر جب سے کمپنی میں مزدوروں کا یونین بنا، ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شروع شروع میں تو سیٹھ میوا لال نے کچھ لے دے کر سمجھوتہ کرتے رہے مگر جب مل گھاٹا میں چلنے لگا تو انہوں نے مزید مطالبات ماننے سے انکار کر دیا۔ نتیجتاً فیکٹری میں پچھلے چھ ماہ سے ہڑتال چل رہا تھا۔ آخر میں اکتا کر انہوں نے تالا بندی کا اعلان کر دیا۔ اور مل کو بیچنے کا فیصلہ کر لیا۔

انہیں دنوں سیٹھ جی کا بیٹا منوہر یورپ و امریکہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے واپس وطن آگیا۔ اس کو اپنی مل کا حالات جان کر بڑا افسوس ہوا۔ اس نے اپنے باپ سے التجا کی کہ مل بیچنے سے پہلے اسے ایک دفعہ مل چلانے کا موقع دیں۔ باپ نے بہت اصرار کے بعد اس کی بات مان لی۔

منوہر نے سبھی مزدوروں کی ایک میٹنگ بلائی۔ اور بہت ہی جذباتی انداز میں تقریر کرتے ہوئے مزدوروں سے ہڑتال واپس لینے کی اپیل کی اور ساتھ ہی تالا

بندی اٹھالینے کا وعدہ کیا اس نے مزدوروں سے یہ بھی وعدہ کیا کہ مل کے پونجی کا آدھا حصہ دار مزدوروں کو بنا دیا جائے گا۔ سال کے آخر میں ہونے والے منافع کا آدھا مزدوروں میں تقسیم کیا جائے گا۔ یہ منافع مزدوروں کو ملنے والے مشاہرہ اور دیگر سہولتوں کے علاوہ ہوگا۔ مزدور بخوشی راضی ہو گئے۔ مجبوراً یونین والوں کو بھی راضی ہونا پڑا۔

دوسرے ہی دن مل چالو ہو گیا، سائرن بجتے ہی مزدور پہلے شفٹ میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ منوہر بابو کی جے کرتے ہوئے مل میں داخل ہوئے۔ مزدوروں کی محنت اور منوہر کی دور اندیشی سے ایک سال کے اندر ہی مل نے اپنا پرانا مقام حاصل کر لیا۔ دوسرے سال میں مل نے سارے ملک میں سب سے زیادہ منافع کمایا۔ اور اپنے حصہ داروں کو سب سے زیادہ منافع تقسیم کیا جس سے مزدور بہت زیادہ مستفیض ہوئے۔ یہ انہیں ملنے والی بونس سے کہیں زیادہ تھا۔ پانچ سال کے اندر اندر منوہر نے کپڑے کی کئی ملیں ملک کے طول وعرض میں قائم کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میوہ لال گروپ ملس کا جال پورے ملک میں پھیل گیا۔ سیٹھ میوالال مل کو بیچ کر کنگالی کی حالت میں جانے والے تھے۔ منوہر کی دور اندیشی، معاملہ فہمی اور لگن کی وجہ کر سیٹھ میوالال ملک کے سب سے بڑے سرمایہ دار بن گئے۔ ان کے ملوں میں ہڑتال نام تک نہ رہا۔

ایک دن میوالال نے اپنے چیمبر میں منوہر کو بلایا اور اسے گلے لگاتے ہوئے بولا۔ بیٹا! واقعی تم نے کایا پلٹ کر دیا۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ اگر سبھی سرمایہ دار تمہارے جیسے سمجھ بوجھ والے فراخ دل ہو جائیں تو اس ملک سے مالک مزدور کا جھگڑا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ مالک مزدور شیر وشکر بن کر رہیں گے۔ ہمارا ملک دنیا کا ایک بڑا صنعتی ملک ہو جائے گا۔ انہوں نے منوہر کو میوالال گروپ آف ملس کا مینیجنگ ڈائرکٹر بنا دیا۔ مالک مزدور کے میل، سمجھداری محنت ولگن سے موسم خزاں ختم ہوا، اور چاروں طرف بہار ہی بہار تھا۔

—— ۰ ——

اندھ وشواش

ششما نئی تہذیب میں پلی بڑھی لڑکی تھی۔ اس کے باپ کھیم چند ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو پوری آزادی دے رکھی تھی۔ وہ کالج میں پڑھنے کے علاوہ کھیل کود میں بھی حصہ لیتی تھی۔ جوڈو اور کراٹے کا کورس بھی کر رہی تھی۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد کھیم چند کو بیٹی کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ بڑی تگ و دو کے بعد ایک اچھا خاندان مل گیا۔ لڑکا برسرروزگار تھا۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ سسرال کی اکلوتی بہو تھی۔ ساس سسر بہت پیار کرتے۔ شوہر کا تو کہنا ہی کیا۔ ہاتھوں ہاتھ لئے رہتا۔ باپ نے تلک جہیز دینے میں کوئی کمی نہیں رکھ چھوڑی تھی۔ ششما خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سگھڑ بھی تھی۔ سسرال والوں کا اس نے دل جیت لیا تھا۔ غرض کہ ششما کی زندگی خوشیوں سے مالا مال تھی۔ چار، پانچ سال کا وقفہ کیسے کٹا، پتہ ہی نہیں چلا۔

پانچ، چھ سال تک جب بہو کا گود نہیں بھرا تو ساس کو فکر ستانے لگی پہلے تو بہو کو ڈاکٹر، حکیم اور وید کو دکھلایا۔ پھر پیر، فقیر، مندر، مزار اور درگاہ کا چکر لگانے لگیں۔ پوجا پاٹ، برت ہون، کرتن سب کرایا مگر کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوا۔

اچانک شہر میں ایک چمتکاری بابا بھگت داس کے تشریف لانے کی چرچا

ہونے لگی۔ ان کا بہت شہرہ تھا۔ لوگ دور دور سے ان کے پاس اپنی مرادیں پوری کرنے پہنچتے۔ باباکی دعا تعویز سے بچے کی امید میں عورتوں کا اژدہام رہتا۔ ششما کی ساس نے بھی جب بابا کے بارے میں سنا تو وہ بھی پوتا پانے کی امید میں بہو سے بابا کے پاس چلنے کو کہا۔ ششما نئے خیال کی لڑکی تھی۔ اسے ان باتوں پر اعتقاد نہ تھا۔ مگر ساس کے لحاظ سے چپ رہتی۔ مجبوراً ساس جہاں کہتی تھی چلی جاتی تھی۔ جب ساس نے بابا بھگت داس کے یہاں چلنے کو کہا تو پہلے تو اس نے ٹالنا چاہا مگر ساس کی ضد کے آگے اسے سرنگوں ہونا پڑا۔ ایک دن ساس بہو تیار ہو کر بابا بھگت داس کے یہاں پہونچ گئیں۔ وہاں ایک میلہ لگا تھا۔ چاروں طرف عورتوں، مردوں کی بھیڑ تھی۔ مختلف قسم کے سامانوں اور کھانوں کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ بابا کے درشن کے لئے لمبی قطار لگی تھی۔ جو دن رات لگی رہتی تھی۔ بابا کمرہ کے اندر بند رہتے تھے۔ اور مریض کو اکیلے درشن کے لئے جانا پڑتا تھا۔

لمبی قطار میں لگے لگے جب ششما کا نمبر آیا تو بابا کے پاس اکیلے جانے میں اس کو بڑی ہچکچاہٹ ہوئی۔ اس نے ساس کو بھی اندر چلنے کو کہا مگر دروازہ پر کھڑے بابا کے چیلا نے ساس کو روک دیا۔ مجبوراً ششما کو اکیلے اندر جانا پڑا، وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔

بابا نے معنی خیز نظروں سے ششما پر مسکراتے ہوئے نظر ڈالی۔ ششما سہم گئی بابا دری پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ انھوں نے ششما کو قریب بٹھایا، ششما، قیمتی کپڑوں اور زیوروں سے لدی تھی۔ بابا نے ایک نظر میں تاڑ لیا کہ اچھے گھرانہ کی عورت ہے۔ پوچھا بچی کیا تکلیف ہے۔ ششما نے لجاتے ہوئے اپنا حال سنایا۔ بابا نے ششما کا ہاتھ دیکھنے کے بہانے اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے سہلانا شروع کر دیا پھر بولے بچی اور قریب آجا۔ ششما خوفزدہ تھی مگر وہ تھوڑا اور قریب

کھسک گئی۔ بابا نے اسے دبوچ کر اپنے باہنوں میں لینا چاہا۔ مگر ششما سنبھل گئی۔ اس نے بابا کا منشا سمجھ لیا۔ وہ بابا سے تھوڑی دور ہٹ گئی۔ بابا اس کی طرف لپکے۔ ششما نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے کراٹے کا ایک ایسا ہاتھ بابا کے گردن پر مارا۔ کہ وہ گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔ ششما دوڑتی ہوئی باہر بھاگی اور ساس سے لپٹ کر رونے لگی۔ وہاں ہنگامہ کھڑا ہو گیا، بابا کا چیلا ہلا کرنے لگے کہ ششما نے بابا کا خون کر دیا ہے۔ مگر ششما نے رو رو کر حال بتایا تو لوگوں کو سچائی کا پتہ چلا۔ ششما کے سسر کو فون کیا گیا وہ پولس کے ساتھ وہاں پہونچے۔ ششما کا بیان لیا گیا پولس نے بابا کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ اس کے بعد ان کا پورا پول کھلا۔ عورتیں شرم اور عزت کی وجہ کر کمرہ کے اندر بابا کی کرتوتوں کی باتیں نہیں بتاتی تھیں۔ جو عورتیں بچے کی امید میں بابا کے پاس جاتی تھیں بابا ان کی عزت سے کھیلواڑ کرتے تھے۔ اتفاقاً اسی میں سے کوئی پہلے سے حاملہ رہتی یا بابا کے منھ کالا کرنے کی وجہ کر امید سے ہو جاتیں اور اسی وجہ کر بابا کی شہرت ہو گئی۔ ساتھ ساتھ بابا عورتوں سے زیورات و نقدی پوجا پاٹ جاپ اور ہون کے نام پر ٹھگ لیتے تھے۔ ششما کی ساس کافی شرمندہ ہوئی اور پھر بہو کو کسی بابا کے پاس جانے کے لئے نہیں کہا۔ سسر بھی اپنی بیوی پر کافی ناراض ہوئے۔

ششما اور اس کے شوہر کو ماہرین سے دکھایا گیا۔ اس کے شوہر میں کچھ نقص تھا۔ جس کا علاج ہوا۔ ششما کے پاؤں بھاری ہوئے۔ اور وہ جڑواں بچوں کی ماں بنی۔ ساس سسر کے خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ بابا پر مقدمہ چلا انہیں قید بامشقت کی سزا ملی۔ ناری مکتی مورچہ نے ایک جلسہ کیا اور ششما کو اس کی ہمت اور دلیری کے لئے سراہا گیا۔ اور انعام دیا گیا۔ اس کی ہمت کی وجہ کر بہت سی عورتیں بابا کی ہوس کا شکار ہونے سے بچ گئیں۔ ششما مورچہ کی نئی سکریٹری چنی گئیں۔ اس نے اپنی تقریر میں عورتوں کو

پرانے اندھ وشواس سے نکل کر نئے دور میں شامل ہونے کی تلقین کی۔ انہیں ہمت اور ایک جٹ ہوکر ان پر ہونے والے بے جا ظلم و ستم کا مقابلہ کرنے اور سماج میں پھیلی برائیوں کو ختم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کی اپیل کی۔ زوردار تالیوں کے ساتھ اس کی تقریر ختم ہوئی۔ اس کی ساس نے جلسہ کے بعد اسے گلے لگا لیا۔ اور بہو سے اس کی اندھ وشواش کی وجہ کر ہوئے حادثہ کے لئے معافی مانگی۔ سشما نے ساس کا پاؤں چھوتے ہوئے کہا! ماں! آپ میری ماتا ہیں۔ مجھ سے معافی نہ مانگیں۔ بلکہ مجھے آشرواد دیں تاکہ میں ناری جاتی پر ہو رہے اتیاچار کے لئے کچھ کر سکوں۔ ساس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا بیٹی! تو ضرور کامیاب ہوگی۔ جب تم نے میری آنکھیں کھول دیں ہیں تو سماج کی آنکھیں بھی کھولنے میں ضرور کامیاب ہوگی میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔

———— ۰۰ ————

پرایا خون

حاتم اچھا کھاتا پیتا کاشتکار تھا۔ چھوٹی سی زمین داری تھی اس کی صرف تین بیٹیاں تھیں اسے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ حاتم اور اس کی اہلیہ خدا ترس انسان تھے بڑی اور منجھلی لڑکی کی شادی زمین دار خاندان میں کر چکے تھے۔ چھوٹی لڑکی ابھی کم عمر تھی۔ حاتم اور اس کی اہلیہ زیتون خدا ترس انسان تھے۔ خدا نے انہیں سبھی نعمتیں دے رکھی تھی۔ صرف ایک بیٹا نہ ہونے کا کسک دل میں تھا۔ مگر وہ دونوں مشیئت ایزدی پر صابر و شاکر تھے۔ زندگی کے دن ہنسی خوشی گذر رہے تھے۔ زمین داری کی دیکھ بھال کے بعد بقیہ وقت خدا کی یاد میں گزارتے۔ رعیت کو وہ لوگ اولاد کی طرح مانتے تھے۔

اچانک گردش ایام نے حاتم کو مصیبتوں نے گھیر لیا۔ اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس کی بڑی لڑکی محسنہ ایک لڑکے کو اپنے پیچھے چھوڑ کر خدا کی پیاری ہو گئی۔ دوسری لڑکی ثمینہ ایک بچی کو جنم دیتے ہی اپنے مالک حقیقی سے جا ملی۔ حاتم بھی اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکا۔ اور کچھ ہی دنوں بعد اس دنیا سے چل بسا۔ اب ساری ذمہ داری حاتم کی بیوی زیتون پر آ گئی۔ لیکن وہ بھی معدہ کی دائمی مریض تھی اس پر لگاتار دو بیٹیوں اور شوہر کی جدائی نے اسے کھوکھلا دیا۔ محسنہ اور ثمینہ کے بچوں کے پالنے کی ذمہ داری

زرینہ پر آگئی زرینہ کی عمر ابھی بمشکل دس گیارہ سال تھی کہ خاندان والوں کے دباؤ میں اس کی شادی اپنے مرحومہ بہن شمینہ کے شوہر شکور کے ساتھ کردی گئی۔ جب زرینہ کی رخصتی ہوئی تو وہ ساتھ میں اپنی مرحومہ بہنوں کی اولاد محمود اور محمودہ کو ساتھ لے کر ڈولی میں سسرال گئی۔ وہاں بھی وہ دونوں کو اپنے سینے سے چپکا کر سلاتی۔ اسے ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا کہ کہیں یہ دونوں بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑ دیں۔ زرینہ کے شوہر شکور اس کی پھوپھی کے لڑکے تھے۔ وہ نہایت ہی خلیق اور نیک انسان تھے۔ وہ اپنی بیوی کا پورا پورا ساتھ دیتے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کی پوری ذمہ داری ان پر تھی۔ وہ ان لوگوں پر بے دریغ رقم خرچ کرتے۔ کبھی کسی بات پر منھ میلا نہیں کرتے تھے۔ وہ بمشکل بیوی کو یہ سمجھا سکے کہ سینہ سے چپکائے رکھنے سے ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ خدا سے دعا کرو وہ ان لوگوں کو با حیات کرے گا۔ غرض کہ زرینہ اور شکور اپنی اولاد سے زیادہ دونوں بچوں کو پیار کرتے۔ اس درمیان زرینہ کی ماں کا بھی انتقال ہو گیا اب وہ تھی اور محمود اور محمودہ۔ دن رات دونوں کی دیکھ بھال میں لگی رہتی۔ اپنے تن من کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ خدا نے اس کو چار بیٹے عطا کئے مگر تین یکے بعد دیگرے اس کا ساتھ چھوڑ گئے صرف ایک لڑکا اظہر بچ گیا۔

زرینہ اور شکور کو اپنے بچوں کی موت کا گہرا صدمہ ہوا۔ مگر وہ لوگ اظہر محمود اور محمودہ کو دیکھ کر جی رہے تھے۔ شکور شروع ہی سے خدمت خلق میں مشغول تھا۔ اس نے اور زیادہ وقت اس میں لگا دیا۔ اپنے تن من دھن سے لوگوں کی دن رات خدمت کرنا ہی اس کا نصب العین بن گیا۔ ساتھ میں تینوں بچوں کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا دھیان رکھتا۔ محمودہ بالغ ہو گئی اس کی شادی دھوم دھام سے اچھے گھرانے میں کردی۔ اور محمود پڑھ لکھ کر سرکاری محکمہ میں برسر روزگار ہو گیا زرینہ کے والدین کی زندگی ہی میں اس کی بہنوں کا انتقال ہو گیا تھا اس وجہ کر محمود اور

محمودہ نانا کی جائیداد سے محجوب ہو گئے تھے۔ مگر زرینہ نے دونوں کو حاجب قرار دیتے ہوئے اپنے والد کے جائیداد کا تین برابر حصہ کر کے ایک حصہ اپنے نام اور ایک ایک حصہ اپنی دونوں بہنوں کے بچوں کے نام کر دیا۔ دونوں کو برابر غلہ اور رقم بھیجا جاتا۔ ہر آڑے وقت پر بھرپور مدد بھی کی جاتی۔

خدا نے زرینہ اور شکور کو دو لڑکا اور تین لڑکیاں مزید عطا کیں جو باجیات رہے ان سبھوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سے ان کا خرچ بڑھ گیا۔ دوسری طرف زمین داری خاتمہ کے بعد قومی و سماجی خدمت میں لگے رہنے کی وجہ کر کاشتکاری پر کم دھیان دینے کا موقع ملتا تھا۔ نتیجتاً آمدنی کم ہو گئی۔ پھر بھی وہ لوگ زندگی کی گاڑی کسی طرح کھینچتے رہے۔ محمود اور محمودہ کا پہلے سا مدد کرنا ان لوگوں کے لئے ممکن نہ رہا تھا۔ لیکن موقع پڑنے پر زمین بیچ کر بھی ان لوگوں کی مدد کرتے رہے۔

اللہ اللہ کر کے بڑا لڑکا اظہر نے بی، اے پاس کر کے وکالت میں داخلہ لے لیا۔ اس کے کتاب اور فیس کا مسئلہ درپیش تھا۔ اسی دوران زمین داری ختم کیا جانے کا معاوضہ کا بقیہ رقم بٹنے کی خبر آئی۔ محمود اور محمودہ کو حاجب کئے جانے کی وجہ کر ان لوگوں کو بھی رقم ملنی تھی۔ محمود اور محمودہ نے اپنے خالہ   کو مختار نامہ لکھکر دے دیا کہ اس رقم کو نکال کر اظہر کی تعلیم پر خرچ کریں۔ زرینہ اور شکور اس کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ مگر محمود اور محمودہ کے ضد کے آگے انہیں جھکنا پڑا۔

رقم نکاسی کے کچھ دنوں بعد محکمہ سے ایک نوٹس زرینہ اور شکور کے نام ملا کہ آپ لوگوں نے غلط دستخط کر کے رقم نکال لیا ہے۔ آپ لوگوں پر قانونی کارروائی کی جائے گی۔ محمود اور محمودہ کے وکیل کا ایک قانونی نوٹس بھی اس سلسلے میں ملا۔ نوٹس پاکر یہ لوگ بوکھلا گئے۔ ایسی توقع محمود اور محمودہ سے ان لوگوں کو نہ تھی۔ ان لوگوں کو خون پسینہ ایک کر کے پالا تھا۔ انہیں کی ضد پر ان لوگوں کے مختار نامہ پر رقم نکالی گئی تھی۔

اب یہ الزام لگایا جا رہا تھا کہ جعلی دستخط سے مختار نامہ بنا کر رقم نکالی گئی ہے۔ اس سے زرینہ اور شکور کی عزت کو بٹہ بھی لگ سکتا تھا۔ اور ثابت ہو جانے پر سزا بھی ہو سکتی تھی۔ ان دونوں کو گہرا دھکا لگا۔ اظہر وکیل بن چکا تھا اظہر نے ثبوت کے ساتھ جواب تیار کیا۔ اور لکھاوٹ کے ماہرین سے دستخط جانچ کرانے کی مانگ کی۔ دستخط صحیح پایا گیا۔ اور دونوں کا الزام غلط ثابت ہوا۔ ان لوگوں کی درخواست محکمہ نے خارج کر دیا۔ اب محمود اور محمودہ پر دروغ گوئی کا مقدمہ چلنا تھا۔ مگر زرینہ اس کے لئے تیار نہ تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ بچپن میں دونوں نے میرے جسم پر اجابت کیا تو جسم کو کاٹ کر نہیں پھینکا تھا۔ تو اب ان لوگوں کی غلطی پر مقدمہ کیسے کروں۔ وہ لوگ میرے جسم کے حصہ ہیں۔ میں نے ان لوگوں کو اولاد کی طرح پالا ہے۔ ان لوگوں کا بال بھی بیکا ہونے نہیں دوں گی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنا خون اپنا ہوتا ہے۔ پرایا خون پرایا۔ خواہ کتنی ہی محبت کی جائے جان ہی کیوں نہ نچھاور کی جائے پرایا خون اپنا نہیں ہو سکتا۔ میں نے تو اپنی مرحومہ بہنوں کا مرتا ہوا منھ دیکھ کر ان لوگوں کی ناز برداری کی ہے۔ غرض کہ زرینہ نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ اور اتنا واویلا مچایا کہ اظہر کو مقدمہ دائر کرنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔

جیسی کرنی ویسی بھرنی

شیخ تمیز الدین اپنے علاج کے لیے لکھنؤ گئے تو اپنے ساتھ اور لوگوں کے علاوہ اپنے بڑے بیٹے ظہور اور ملازم قمرالدین کو بھی لے گئے۔ شیخ تمیز الدین کی اچھی خاصی زمین داری تھی۔ گاؤں اور شہر میں جب علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا، تو طبیبوں نے لکھنؤ جانے کی صلاح دی اس لیے وہ اپنے کنبہ والوں اور خدمت گاروں کے ساتھ لکھنؤ پہونچے۔ وہاں کرایہ پر مکان لیا گیا اور بڑے حکیم کا علاج شروع ہوا ان کا ملازم دن رات ان کی خدمت کرتا۔ اس کے برعکس ظہور دن رات لکھنؤ کی سڑکوں پر گھومتا رہتا۔ اور سنیما بینی اور سیر سپاٹے میں مشغول رہتا۔ گاہے بگاہے وہ باپ کی خیریت دریافت کر لیتا۔ تمیز الدین کو بہت برا لگتا، وہ بگڑتے کہ میری جان جا رہی ہے اور کمبخت عیش کر رہا ہے۔ اس سے اچھا ملازم قمرالدین ہے جو کہ دن رات خدمت میں لگا رہتا ہے۔ مگر ظہور پر ان باتوں کا ذرہ برابر اثر نہ ہوا۔ اور وہ عیش و موج میں بدستور محو رہا۔ تمیز الدین کی بیماری بڑھتی گئی اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اور لکھنؤ کے چار باغ قبرستان میں مدفون ہوئے۔

ظہور اپنے دیگر افراد خاندان اور ملازمین کے ساتھ واپس گاؤں پہونچا۔ گاؤں واپس آتے ہی اس کی آنکھیں کھلیں۔ سر پہ اچانک ساری ذمہ داری آن پڑی۔

تو باپ کی خدمت اور ٹھیک سے دیکھ بھال نہ کرنے کا اسے ملال ہوا۔ اور اس صدمہ سے دماغ پر اثر پڑا۔ اس پر یہ کہ گھر پہونچتے معلوم ہوا کہ جس روز باپ کی موت ہوئی اسی دن اس کی بیوی کو لڑکا پیدا ہوا۔ جب لڑکے کو لا کر گود میں دیا گیا تو اس نے غصہ میں اس کو پٹک دیا اور چلانے لگا کہ یہ منحوس ہے۔ آتے ہی میرے باپ کو کھا گیا وہ تو خدا کو اس کی حیات منظور تھا جو بچہ زندہ رہا۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے دھیرے دھیرے باپ کے مرنے کا زخم مندمل ہو گیا پھر سب اپنی زندگی کے تگ و دو میں لگ گئے۔ ظہور کا بڑا لڑکا سعید اچھے عہدے پر فائز ہو گیا۔ لڑکیوں کی شادی کر دی مگر پھر بھی تین چھوٹے بچوں کی تعلیم اور شادی کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس کو بوڑھاپے اور بیماریوں نے آگھیرا۔ اسے توقع تھی کہ بیٹا ایسے وقت میں کام دے گا۔ مگر سعید نے آنکھیں پھیر لیں باپ کے علاج کا معقول انتظام بھی نہ کیا۔ انہیں سرکاری اسپتال کے جنرل وارڈ میں ڈال دیا۔ اور بچوں کی تعلیم کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ صرف ایک مخصوص رقم جو ظہور اور اس کے بچوں کے لئے ناکافی تھی ہر ماہ سعید اپنے باپ کو بھیج دیا کرتا۔ اسپتال میں بھی اگر باپ کو دیکھنے جاتا تو واپس آکر فوراً کپڑا اتار دیتا اور غسل کرتا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں باپ کی بیماری اسے نہ پٹ جائے۔ ظہور کو سعید کا رویہ دیکھ کر اپنے باپ کی بیماری کے وقت لکھنؤ میں اس کے رویّہ کی یاد آنے لگی۔ وہ سوچتا شاید خدا اسی کا بدلہ دے رہا ہے۔ اسے اپنے باپ کے ساتھ کئے برتاؤ پر بہت پچھتاوا ہو رہا تھا۔ مگر اب پچھتاوت کیا ہوت ہے جب چڑیا چگ گئی کھیت۔ ظہور نے اپنے بیٹے سعید کو تلقین بھی کیا کہ بیٹا جیسا میں نے اپنے باپ کے ساتھ کیا ہے، ویسا تم مت کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس سے برا برتاؤ تمہارا بیٹا تمہارے ساتھ کرے۔ مگر سعید کے کانوں پر جوں تک نہ رینگا۔ ظہور کو اسپتال سے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ اور کہا کہ گھر لے جایئے وہیں تیمارداری کیجئے۔ بیماری لاعلاج ہے مگر سعید

اسے اپنے گھر نہیں لے گیا۔ ظہور کی بیٹی کو خبر ملی تو وہ اپنے شوہر کے ساتھ آئی اور باپ کو اپنے گھر لے گئی اور بیٹی کے ہی گھر ظہور کا انتقال ہوا۔

سعید نے کافی دولت کمائی، اچھا مکان بنالیا۔ عیش و عشرت کی ساری چیزیں جمع کرلیں۔ خدا نے دو بیٹا عطا کیا۔ دونوں کو اچھے اسکول میں داخل کرایا۔ مگر وہ لوگ پڑھائی میں اچھا نہ کر سکے۔ لہو ولعب میں مبتلا رہے باپ کی ذرہ برابر ان لوگوں کو پرواہ نہ تھا۔ سعید کا بڑا آپریشن ہوا تو وہ لوگ پتنگ بازی میں مشغول تھے۔ بچوں کی عادت بگڑ گئی وہ لوگ پڑھائی مکمل نہ کر سکے کسی طرح ان لوگوں کو سعید نے باہر کمانے کے لئے بھیج دیا۔ غیر ملک میں جاکر ان لوگوں میں کچھ سدھار ہوا یا مجبوری کے تحت خود کو بدلنا پڑا۔ ان لوگوں نے بھی کافی دولت کمائی اور اسی ملک کے ہو کر رہ گئے۔ ماں باپ کو گھوم کر کبھی نہ پوچھا سعید اور اس کی بیوی کو بچوں کی یاد ستاتی۔ اور خاص طور پر ریٹائر ہونے کے بعد سعید کو بچوں کی کمی اور ستانے لگی۔ دونوں میاں بیوی بیٹیوں کے پاس چلے جاتے۔ مگر وہ لوگ کبھی والدین کی خیریت دریافت نہیں کرتے۔ دونوں میاں بیوی بوڑھاپے میں اکیلے زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں اولاد کے رویہ پر بڑا قلق ہوا۔ مگر جب سعید کو اپنے باپ کے ساتھ کئے برتاؤ کی یاد آتی تو بڑی شرمندگی اور ملال ہوتا۔ وہ سوچتا کہ اسے اپنے باپ کے ساتھ کئے برتاؤ کا ہی بدلہ اولاد کے ہاتھوں مل رہا ہے۔ وہ یہ خیال کر کے کانپ جاتا تھا کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی کا مقولہ اس پر صادق آرہا ہے۔ وہ رب العزت کے بارگاہ میں سر بہ سجدہ ہو کر گڑگڑاتا، اور معافی مانگتا کہ خداوند! باپ کے ساتھ کئے برتاؤ کے لئے اسے معاف کردے۔ اور میری اولاد کو راہ راست پر لادے۔

کرنی کا پھل

رمن اور اس کی ٹولی کے لڑکوں کی شرارتوں سے کوئی اچھوتا نہیں رہ گیا تھا۔ خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں۔ پروفیسر تک کو وہ لوگ نہیں بخشتے تھے۔ لڑکیاں تو ان سے اور زیادہ نالاں تھیں۔ کبھی کسی کی اوڑھنی غائب۔ کبھی ڈیسک پر چپکنے والا مادہ لگا دیا جاتا۔ جب وہ معصوم لڑکی اٹھنا چاہتی تو کپڑا ڈیسک سے چپک جاتا۔ اور بڑی مشکل سے وہ اپنا کپڑا چھڑا کر کامن روم کی طرف بھاگتی۔ لڑکوں کی سائیکل سے ہوا نکال دیا جاتا۔ کبھی بلیڈ سے بنیٹ پھاڑ دیا جاتا تھا۔ کبھی چھپکلی کو شرٹ کے اندر رکھ دیا جاتا اور وہ غریب لڑکا گھبرا کر چاروں طرف دوڑنے لگتا۔ اور رمن اپنی ٹولی کے ساتھ دور کھڑا ہنس رہا ہوتا۔ پروفیسر لوگوں کو بھی عجیب و غریب طریقوں سے تنگ کیا جاتا۔ سن رسیدہ پروفیسر شرما کا چشمہ غائب کر دیا گیا۔ وہ بیچارے اسے ڈھونڈتے ہوئے دیوار سے ٹکرا کر گر پڑے۔ اور ہاتھ چھل گیا۔ کسی پروفیسر کے کلاس میں بندر کے بچہ کے دم میں پھلجھڑی باندھ کر چھوڑ دیا جاتا۔ اور کسی کی کرسی پر سانپ کا بچہ لا کر رکھ دیا جاتا۔ اور کلاس میں ایسا بھگدڑ مچتا کہ کلاس ہی نہیں ہو پاتا۔

غرض کہ کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ جو ان لوگوں کی شرارتوں کا شکار نہ ہوا ہو۔

ایک دن تو پرنسپل کی کار کی ہوا نکالتے ہوئے ان لوگوں کو پکڑ لیا گیا۔ کئی دفعہ ان کی

شکایتیں ہوئیں جرمانہ ہوا۔ لیکن وہ لوگ اپنی شرارتوں سے باز نہیں آئے۔
پرنسپل کے کار سے ہوا نکالتے پائے گئے تو پرنسپل کا پاؤں پکڑ لیا۔ انہوں نے بہت سخت تنبیہہ کرتے ہوئے معاف کر دیا۔ ان لوگوں کے والدین کو بلا کر آگاہ کر دیا گیا کہ اگر آئندہ ان لوگوں نے ایسی حرکت کی تو کالج سے نکال دیا جائے گا۔ گھر میں بھی ان لوگوں کی کافی سرزنش ہوئی۔ کچھ دنوں تک وہ لوگ سہمے سہمے رہے۔ مگر کتے کی دم سیدھی کہاں رہنے والی تھی۔ پھر شرارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

پروفیسر دیال نئے نئے کالج میں آئے تھے۔ انہیں رمن اور اس کے ٹولی کی شرارتوں کی جانکاری نہیں تھی۔ رمن نے اپنی ٹولی سے کہا کہ پروفیسر دیال کی ایسی ریگنگ کی جائے کہ وہ اسے بہت دنوں تک یاد رکھیں۔ رمن موقع کی تلاش میں تھا ایک دن اس کو موقع مل ہی گیا وہ کلاس سے نکلا تو دیکھا کہ پروفیسر دیال نیچے جانے کے لئے زینہ کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ وہ دوڑ کر زینہ پر گیا اور اپنے بیگ سے کیلے کے چھلکے نکال کر ڈال دیا اور تیزی سے واپس کامن روم میں چلا گیا۔ پروفیسر دیال زینہ کے نزدیک پہنچ کر پھر واپس ہو گئے انہیں لائبریری سے ایک کتاب لینی تھی۔ یہ یاد آتے ہی وہ لائبریری کی جانب بڑھ گئے۔ نیچے کہیں بندر کے کودنے کی آواز سن کر رمن یہ سمجھا کہ پروفیسر دیال گر گئے ہیں ان کی حالت دیکھنے کے لئے رمن تیزی سے زینہ کی طرف دوڑا، وہ اپنی شرارت کا نتیجہ سے سرشار ہو کر دوڑ رہا تھا کہ اسے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ کیلا کا چھلکا ابھی بھی وہیں موجود ہے۔ رمن کا پاؤں کیلے کے چھلکے پر پڑا اور اس کا توازن بگڑ گیا۔ وہ لڑھکتے ہوئے زینہ کے نیچے پہونچ گیا اس کا سر پھٹ گیا تھا اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ پروفیسر دیال اپنی کتاب لے کر زینہ کی جانب بڑھے، تو کیلے کے چھلکے پر ان کی نظر پڑی۔ انہوں نے چھلکا اٹھا کر کوڑا دان میں ڈال دیا۔ اور زینہ سے نیچے چلے گئے نیچے اترتے ہی ان کی نظر خون میں لت پت رمن پر پڑی انہوں

نے دوڑ کر پرنسپل صاحب کو خبر کی۔ پرنسپل صاحب نے رمن کو پہچان لیا فوراً اپنی کار میں لاد کر رمن کو اسپتال لے گئے ساتھ میں پروفیسر دیال بھی گئے۔ ڈاکٹر نے فوراً خون چڑھانے کے لئے کہا پروفیسر دیال نے اپنا خون دینے کی پیش کش کی۔ ان کا خون رمن کے خون گروپ سے مل گیا۔ فوراً پروفیسر دیال کا خون نکال کر رمن کو چڑھایا گیا۔ رمن کے والد کو خبر کیا گیا وہ بھی پہونچ گئے۔ تین چار گھنٹے میں رمن کو ہوش آیا۔ تو دیکھا کہ کوئی اس کے سر پہ ہاتھ رکھے بیٹھا ہے۔ اس نے نظریں گھما کر دیکھا تو وہ پروفیسر دیال تھے۔ اس کے والد نے رمن کو سب حال بتایا تو رمن جھٹ سے اٹھ کر پروفیسر دیال کے پاؤں پر گر پڑا۔ اس نے روتے ہوئے کہا سر! میں نے آج تک سبھی کو تنگ کیا ہے۔ کبھی کسی کی بھلائی نہیں کی۔ آج بھی آپ ہی کے لئے کیلا کا چھلکا ڈالا تھا زینہ پر۔ تاکہ آپ پھسل کر گر پڑیں۔ مگر خود ہی اس پر پھسل کر گر پڑا اور یہ حال ہوا۔ پروفیسر دیال نے رمن کو اپنے پاؤں پر سے اٹھا کر بستر پر لٹاتے ہوئے کہا ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تمہیں اگر اپنی غلطی کا احساس ہے تو آئندہ کے لئے اپنی شرارتوں سے توبہ کر لو تو تم بھی نیک انسان بن سکتے ہو۔ اور لوگوں کی بھلائی کر سکتے ہو۔ رمن نے کان پکڑتے ہوئے کہا سر! آج سے کوئی شرارت نہیں کروں گا۔ اپنی کرنی کا پھل مجھے مل گیا ہے۔ اس نے اپنے باپ اور پرنسپل صاحب کا بھی پاؤں چھو کر معافی مانگی۔ پرنسپل صاحب اور اس کے باپ یہ دیکھ کر دل ہی دل میں بڑے خوش ہو رہے تھے کہ جس لڑکے کو وہ لوگ اتنے دلوں تک صحیح راستے پر نہ لا سکے وہ پروفیسر دیال کی وجہ کر ایک دن میں راہ راست پر آگیا۔

خدا کا امتحان

نمازی میاں آرام سے نیا کپڑا پہنے اپنے گھر کے باہر کھاٹ پر پڑے بیڑی پھونک رہے تھے۔ آنے جانے والے لوگوں میں ایک' دو نے ٹوکا کہ نمازی میاں کم سے کم عید کی نماز بھی پڑھ لو مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ نام تو نمازی تھا مگر نمازی میاں نے آج تک نماز نہ پڑھی تھی۔ وہ پانچ، آٹھ، کھاٹ یا تین سو ساٹھ (پنج گانہ، جمعہ، جنازہ یا عیدین) کسی کے بھی نمازی نہ تھے۔ وہ اپنے یار دوستوں میں ہنس کر کہا کرتے میرا نام ہی نمازی ہے نماز پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ روزہ رکھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا ان کی دلیل تھی کہ جس کے پاس کھانے کو نہیں ہے وہی روزہ رکھے گا۔ اللہ میاں نے تو مجھے ساری نعمتیں دے رکھی ہیں۔ پھر روزہ کس بات کا رکھوں؟ تبلیغی جماعت والوں نے بھی انہیں بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ نمازی میاں اچھے کاشتکار تھے۔ گھر میں کسی طرح کی کمی نہ تھی اللہ نے سب کچھ دے رکھا تھا۔ مگر وہ کبھی شکرانہ بھی ادا کرنا گوارہ نہ کرتے۔ اور نہ کبھی کسی غریب یا ضرورتمند کی مدد کرنا پسند کرتے۔ کنجوس تو وہ مکھی چوس کے حد تک تھے۔

اچانک پراسرار بیماری علاقہ میں پھیل گئی۔ گاؤں میں پہلے پہل یہ بیماری نمازی میاں کے گھر میں ہوئی۔ اس بیماری میں چھوٹے بچوں کو بخار آتا اور پیٹ خراب ہو جاتا۔ اچانک بخار تیز ہو کر سر پر چڑھ جاتا۔ اور بچے کی کچھ ہی گھنٹوں میں موت ہو جاتی۔ سینکڑوں

بچے اس بیماری کے لقمہ بن چکے تھے۔ پورے علاقے میں ہاہا کار مچا ہوا تھا۔ شہر کا اسپتال بچوں سے بھرا پڑا تھا۔ ڈاکٹر سر جوڑ کوشش کر رہے تھے مگر یہ بیماری ان کے سمجھ سے باہر تھا۔ وہ لوگ اسے لاعلاج مان رہے تھے۔ نمازی میاں کے چھ بیٹے تھے۔ یکے بعد دیگرے پانچ بیٹا اس مرض کا شکار ہو کر لقمہ اجل بن چکا تھا۔ چھٹا بچہ بھی اس مرض میں مبتلا ہو گیا۔ نمازی میں اسے لیکر فوراً شہر بھاگے۔ ڈاکٹروں نے حتی الامکان کوشش کی۔ ڈاکٹروں نے نمازی میاں کے بارے میں جب سنا کہ ان کا پانچ بیٹا اسی مرض کا شکار ہو چکا ہے اور چھٹا بھی اس مرض میں مبتلا ہے تو ان لوگوں کو نمازی میاں سے ہمدردی ہو گئی۔ نمازی میاں کی بیوی کا بُرا حال تھا۔ اس پر بے ہوشی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے نمازی میاں سے کہا کہ ہم لوگ پوری کوشش کر رہے ہیں۔ دلی سے بھی ڈاکٹر آئے ہیں جانچ کر رہے ہیں۔ اگر مرض کا تشخیص ہو گیا تو علاج ممکن ہو سکے گا۔ اور ہم لوگ آپ کے اس بچے کو بچا پائیں گے۔ آپ خدا سے دعا کریں۔ خدا کا نام سن کر نمازی میاں کو خدا یاد آیا مگر انہوں نے تو آج تک نماز نہیں پڑھی تھی اور نہ ہی کبھی خدا کو یاد کیا تھا مسجد میں داخل تک نہ ہوئے تھے اسی وقت مغرب کی اذان کی آواز قریب کی مسجد سے سنائی پڑی۔ نمازی میاں دوڑ پڑے، وضو کیا اور نماز ادا کی۔ نماز کے بعد بڑے ہی خشوع و خضوع کے ساتھ وہ خداوند تعالیٰ کے دربار میں دعا مانگی کہ اے رب العزت تو نے مجھے سبھی نعمتیں عطا کیں مگر میں تیری یاد سے غافل رہا۔ کبھی بھول کر بھی نماز نہ پڑھا اور نہ تجھے یاد کیا اے مالک تو غفورالرحیم ہے میری خطاؤں کو معاف کر دے۔ مجھے میرے کیئے کی سزا مل چکی ہے اب مزید سزا نہ دے۔ مجھے ایک بار سنبھلنے کا موقع دے میں نے نیک راستہ دیکھ لیا ہے میں خواب غفلت سے بیدار ہو چکا ہوں میرے آخری بیٹے کی زندگی بخش دے میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں سچا مسلمان بن جاؤں گا۔ تیرے اور تیرے

حبیب پاکؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلوں گا۔ نماز کے بعد اسپتال پہونچا تو دیکھا
کہ اسپتال میں کافی سرگرمی ہے۔ اور لوگوں کے چہرے پر اطمینان کی جھلک ہے۔
پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ دلی سے آئے ڈاکٹروں نے مرض کا پتہ کرلیا ہے۔ اب وہ
لاعلاج نہیں رہ گیا ہے ہوائی جہاز سے دوا منگوائی جارہی ہے۔ صبح تک دوا
آگئی بچے صحت مند ہوکر گھر جانے لگے۔ نمازی بھی اپنے بچے کو لے کر گھر واپس
ہوا۔ گاؤں پہونچ کر نمازی میاں ایک دم ہی بدل گئے۔ پنج وقتی نمازی ہو گئے خستہ
حال مسجد کی از سر نو تعمیر اپنے خرچ سے کرایا ایک امام اور مؤذن مستقل طور پر
مقرر کیا جن کا مشاہرہ نمازی میاں ادا کرتے اب نمازی میاں نے شرعی داڑھی
بھی رکھ لی۔ روزہ دار بھی ہو گئے غریبوں اور حاجت مندوں کی بھر پور مدد بھی کرتے
اگلے سال نمازی میاں حج کرنے گئے اور حاجی نمازی میاں بن کر لوٹے۔ جو نمازی
میاں لوگوں کے لاکھ کہنے اور سمجھانے پر نہ سدھر سکے خدا کے ایک امتحان سے راہ
راست پر آگئے۔ سچ ہے خدا جسے چاہے سیدھا راستہ دکھا سکتا ہے۔

---- ۰ ----

نوکر

روہت کی عمر بہ مشکل دس بارہ سال ہو گی۔ اسے سشیل بابو نے اپنے بیٹے بابا کو کھلانے کے لئے رکھا تھا۔ بابا کی عمر چار پانچ ماہ کی تھی۔ روہت سارا دن اسے گود میں لیے پھرتا۔ کبھی کبھی بچہ گاڑی میں گھماتا۔ سشیل بابو کی بیوی کامنی بہت ہی غصہ ور اور بد مزاج عورت تھی۔ روہت بڑے پیار سے بچے کو کھیلاتا۔ پھر بھی وہ اس سے ناخوش رہا کرتی۔ بات بات پہ مار پیٹ اور کھانا بند کر دینا عام بات تھی۔ پیٹ بھر کھانا بھی روہت کو نہیں ملتا تھا۔ روہت بہت ہی غریب گھر کا لڑکا تھا اس کے ماں باپ بچپن ہی میں گذر چکے تھے۔ چچا بھی غریب تھا اس لئے سشیل بابو کے یہاں رکھوا دیا تھا تاکہ پیٹ بھر کھانا ملے گا اور مشاہرہ کی شکل میں چچا کو بھی کچھ آمدنی ہو جائے گی۔ سشیل بابو کامنی کو کبھی کبھی اس کی بے جا کڑائی کے لئے ٹوک دیا کرتے تھے مگر کامنی آمادہ دیلا مچاتی تھی کہ انہیں خاموش ہو جانا پڑتا تھا وہ کہتی تھی کہ چپ رہو جی! نوکر چاکر کیسے رکھا جاتا ہے وہ میں خوب جانتی ہوں۔ یہ ہم عورتوں کا کام ہے مجھے ہی کرنے دو تم جھوٹے کے چونچلے مت دکھاؤ اس سے نوکر شوخ ہو جائے گا۔ اگر وہ کہتے کہ پیٹ بھر کھانا تو دو اس پر کامنی کی یہ دلیل تھی کہ زیادہ کھانے سے بیمار پڑ جائے گا۔ یا پسر کر سو جائے گا۔

ایک روز روہت کو سویرے اٹھنے میں دیر ہوئی۔ ویسے تو وہ روزانہ سویرے اٹھتا اور دیر رات گئے سوتا تھا کامنی غصے میں لال پیلی ہوتی ہوئی گئی اور اسے ایک طمانچہ جڑ دیا۔ وہ آنکھوں میں آنسو لیئے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا سنیل نے اس کا چہرہ دیکھ کر اس کا نبض دیکھا تو اسے بخار تھا اس نے کامنی سے کہا کہ روہت کو بخار ہے اسے آرام کرنے دے مگر کامنی کہاں ماننے والی تھی۔ سنیل کے دفتر جاتے ہی روہت سے کہا کہ بابا کو لے جا کر وہ گھما لائے۔ روہت کو بخار کے ساتھ جاڑا بھی آگیا تھا اس نے کانپتے بدن کے ساتھ مالکن کا حکم مانتے ہوئے بابا کو بچہ گاڑی میں لٹا کر گھمانے سڑک پر نکل گیا۔ سڑک پر کچھ ہی دور گیا تھا کہ جاڑا بخار سے اس کے بدن میں زبردست کپکپی پیدا ہو گئی۔ پیچھے ایک گاڑی تیزی سے ہارن بجاتی ہوئی آرہی تھی۔ روہت گاڑی کو سڑک کے کنارے آنا چاہ ہی رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ مگر وہ اس بے ہوشی کی حالت میں بھی گاڑی کو پکڑے رہا۔ پیچھے والی گاڑی کافی تیز رفتار میں تھی۔ ڈرائیور نے بہت بچانے کی کوشش کی مگر گاڑی روہت کے پاؤں پر سے گذر گئی۔ اس کا پاؤں مجروح ہو گیا۔ راہ گیروں نے گاڑی اور روہت کو سڑک کنارے کر دیا۔ جان پہچان والوں نے سنیل کے گھر خبر کیا۔ کامنی یہ خبر سن کر گھبرا گئی۔ اپنے شوہر کو فون کیا۔ سنیل جائے وقوعہ پر پہونچے۔ بابا، روہت اور بچہ گاڑی کو اپنے کار میں ڈالا اور اسپتال پہونچے۔ کامنی بھی وہاں پہونچ گئی وہ اپنے بچے کو سینہ سے چپکا کر رونے لگی۔ اپنے شوہر سے کہا کمبخت کی طبعیت اگر اتنی خراب تھی تو بچے کو کیوں لے گیا تھا۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میں اسکو نہیں چھوڑتی۔ سنیل نے بگڑتے ہوئے کہا ہمیشہ تم اپنی ہی بولتی ہو دوسرے کی سنتی کہاں ہو؟ میں نے سویرے ہی کہا تھا کہ اسے آرام کرنے دو مگر تم ماننے والی کہاں ہو کامنی بھلا کہاں چپ رہنے والی تھی۔ اس نے کہا کہ آپ ہی نے تو اسکو سر پر چڑھا رکھا ہے آپ ہی نے کہہ دیا کہ آرام کرنے دو اس لئے اس نے جان کر بابا کی گاڑی کو دھکا لگوا دینا چاہا تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ میں اس حرامزادہ کو نہیں رکھوں گی، سنیل نے

جائے وقوعہ پر سب باتیں سن رکھی تھیں کہ کیسے بے ہوشی کی حالت میں بھی بابا کی گاڑی کو روہت پکڑے ہوئے تھا۔ اس نے کامنی کو سب باتیں بتائیں کامنی ابھی کچھ بولنے ہی جا رہی تھی کہ روہت کو ہوش آنے لگا اور وہ چلانے لگا بابا کی گاڑی...... بابا کو بچاؤ ...... بابا کی گاڑی۔ سشیل نے کہا لو سنو! بے ہوشی میں بھی وہ بابا کو بچانے کی بات کہہ رہا ہے تم کیسی ہو؟ کہ ابھی تک تم اسے ہی مورد الزام ٹھہرا رہی ہو۔ تم میں کچھ بھی انسانیت باقی ہے تو اب بھی ہوش میں آؤ۔ کامنی پر بے ہوشی میں روہت کی کہی ہوئی باتیں اور سشیل کے تلقین کا اثر ہوا وہ خاموش ہو گئی اور کچھ دیر بعد سشیل سے افسردہ لہجہ میں بولی۔ واقعی میں روہت کو نہیں پہچان سکی۔ میں سمجھتی تھی کہ سبھی نوکر ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ اور روہت کے بستر کے پاس جا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں! روہت آنکھیں کھولو۔ بابا ٹھیک ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہاری طبعیت کیسی ہے؟... روہت کے کانوں میں اپنے مالکن کی میٹھی آواز گئی تو اس نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھول دیں اور تعجب سے مالکن کی طرف دیکھنے لگا۔ آہستہ سے بولا مالکن! میں کہاں ہوں؟ کامنی نے بہت ہی پیار سے جواب دیا بیٹا! تم اسپتال میں ہو تم بیہوش ہو کر گر گئے تھے اور تیز رفتار گاڑی سے تمہاری ٹانگ زخمی ہو گئی ہے لیکن تم فکر نہ کرو۔ بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ مالکن کی زبان سے بیٹا لفظ سن کر روہت کی آنکھوں میں آنسو آ گیا۔ اور بولا مالکن آپ نے مجھے بیٹا کہا۔ مالکن بولیں ہاں بیٹے تم آج سے مجھے ماں جی کہو گے۔ تم نے اپنی جان پر کھیل کر بابا کی جان بچائی ہے۔ تو تم بیٹے ہی تو ہو۔ روہت مالکن میں اس انقلابی تبدیلی پر حیران تھا تو سشیل بھی پاس کھڑا اپنی بیوی کی تبدیلی پر مسکرا رہا تھا۔

---- ۰۵۰ ----

سوگ

انیل اور نہال ایک ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔ دونوں دل و جان سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھا چکے تھے۔ انیل کے والد روشن لال بچپن سے ہی انیل کی منسوب اپنے جانی دوست شاردا مل کی لڑکی شانتی سے طئے کئے تھے۔ وہ اس کو اتنا پختہ مانتے تھے کہ شاردا مل کو سمدھی اور شانتی کو بہو کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ شانتی بھی کالج میں پڑھ رہی تھی مگر نہال اور شانتی میں بڑا فرق تھا۔ شانتی پورب تھی تو نہال پچھم۔ شانتی پرانے ماحول میں پلی بڑھی لڑکی تھی نئے دور کی ہوا تک اسے نہیں لگی تھی۔ سر پر آنچل، گوڑ لگ کر پرنام کرنا۔ پوجا پاٹ اور برت رکھنا۔ کلب اور پارٹی کو ناپسند کرتی تھی۔ دوسری طرف نہال نئے دور سے مطابقت رکھتی تھی۔ نئی تہذیب اور نئے ماحول میں پروردہ، سیر سپاٹے، پکنک، ڈنر، کلب، ڈانس کی دلدادہ، پیر چھونا وہ معیوب سمجھتی تھی۔ ہیلو اور بائی بائی سے مخاطب ہوتی یا وداع ہوتی۔ پردہ کا تو نام بھی نہیں جانتی تھی۔ اوڑھنی کبھی اوڑھا ہی نہیں۔ گویا اگر نہال آسمان تھی تو شانتی زمین۔ نہال بہت ہی پڑھی بڑھی اور باتونی لڑکی تھی تو دوسری طرف شانتی خاموش اور کم گو تھی۔ انیل شانتی کو کسی طرح پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے نہال کو شریک زندگی بنانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

انیل اور شانتی کالج سے فارغ ہو گئے تو شاردا مل شادی کے لئے زور ڈالنے لگے۔ روشن لال تو پہلے ہی تیار تھے۔ شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ مگر انیل نے نانکر شروع کر دیا پہلے تو بہانہ بنایا کہ ابھی شادی نہیں کروں گا جب باپ نے کہا کہ شادی کے بعد دونوں کو ولایت بھیج دوں گا تو صاف مکر گیا اور اپنی پسند بتاتے ہوئے کہا کہ اگر وہ شادی کرے گا تو نہاں سے۔ باپ یہ سن کر آگ بگولا ہو گئے۔ بولے میں نے اسی دن کے لئے تم کو پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا کہ تم بڑے ہو کر میری ناک کٹواؤ گے۔ میں نے بچپن سے یہ منسوب طے کر رکھی ہے دل سے شانتی کو بہو مان رکھا ہے۔ انیل نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ بچپن کے منسوب کی کیا اہمیت ہے زندگی مجھے گذارنی ہے، آپ کو نہیں۔ میں اس سے شادی ہرگز نہیں کر سکتا۔ باپ نے دیکھا کہ انیل کسی طرح بھی ماننے کو تیار نہیں ہے۔ تو اس نے دھمکی دی کہ اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں زہر کھا لوں گا۔ کیونکہ زندہ رہ کر میں بے عزتی برداشت نہیں کروں گا۔ سارا شہر جانتا ہے کہ میں بات کا دھنی ہوں۔ میرا قول اگر جھوٹا ہو جائے گا تو زندہ رہنے سے کیا فائدہ! روشن لال کے اس دھمکی کا اثر انیل پر ہو گیا وہ شانتی سے شادی کرنے پر رضامند ہو گیا۔ اس نے دل ہی دل میں یہ سوچ لیا کہ شانتی سے شادی کر کے باپ کی خواہش پوری کر دے گا۔ اور بعد میں کسی طرح شانتی سے چھٹکارا پا کر نہاں کو اپنا لے گا۔

انیل کے ہاں کرنے کے بعد بڑی دھوم دھام سے انیل اور شانتی کی شادی ہو گئی۔ روشن لال اور ان کی بیوی نے خوشی خوشی تیرتھ کا ارادہ کر لیا۔ اور گھر کی چابی بہو کے حوالے کر کے وہ لوگ تیرتھ کے لئے روانہ ہو گئے۔ ماں باپ کو جاتے ہی انیل کو پوری آزادی مل گئی۔ اس کو روک ٹوک کرنے والا کوئی نہ رہا۔ پہلے تو وہ چھپ چھپا کر نہاں سے ملتا۔ اب نہاں گھر میں آنے لگی روزانہ پارٹی اور ڈانس کا اہتمام ہوتا۔ دیر رات تک پینے پلانے کا شغل چلتا۔ جب پارٹی کے بعد انیل اوپر اپنے کمرے میں آتا تو دیکھتا کہ

شانتی کھانا ملئے اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ بولتا کہ مجھے بھوک نہیں ہے اور لیٹتے ہیں دھت بستر پر ڈھیر ہو جاتا۔ شانتی اس کا جوتا اتارتی اور کپڑے تبدیل کرتی۔ کبھی کھاتی اور کبھی بنا کھائے سو جاتی۔ سویرے ہوتا تو انیل تیار ہو کر ناشتہ کرتا اور بنا کچھ کہے روانہ ہو جاتا پھر شام میں نظر آتا دن بھر یہ پلان بناتے رہتا کہ کیسے شانتی سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

ایک دن جب انیل سویرے سویرے گھر سے جانے لگا تو شانتی نے بڑی ملتجیانہ لہجہ میں کہا کہ آج شام جلدی آجانا آج ...... اس نے ابھی جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ وہ یہ بولتا ہوا جلدی سے چل دیا کہ کیا میں تمہارے باپ کا نوکر ہوں کہ جلدی آجاؤنگا وہاں سے سیدھے وہ مہاں لی کے یہاں پہونچا۔ مہاں پہلے ہی تیار بیٹھی تھی دونوں گھومنے نکل گئے۔ گھومتے گھومتے دونوں صرافہ بازار کی طرف نکل پڑے۔ ایک دکان پر گئے تو مہاں کو ایک ہیرے کا ہار پسند آگیا۔ قیمت دینے کے لئے پرس نکالا تو رقم کم پڑی۔ اس نے مہاں سے کہا کہ تم ہار پسند کر دو میں فوراً گھر سے رقم لے کر واپس آرہا ہوں۔ وہ تیزی سے کار چلاتا ہوا گھر پہونچا دبے پاؤں گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ شانتی زینہ پر چڑھ کر اوپر جارہی ہے۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اچھا موقع ہے آج ہی شانتی سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ وہ دبے پاؤں شانتی کا پیچھا کرتا ہوا اوپر پہونچا تو دیکھا کہ شانتی چھجے کی طرف جارہی ہے۔ وہ بھی اسی طرف ہولیا۔ شانتی چھجے پر جاکر کھڑی ہوگئی۔ وہ آہستہ آہستہ بنا کوئی آواز کئے اسکے پیچھے پہونچا۔ اور اتنا زور سے دھکا دیا کہ شانتی سیدھے نیچے چلی گئی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ اس کے منھ سے کوئی آواز تک نہیں نکل سکی۔ لیکن شانتی کے ہاتھ میں پوجا کا تھال اور جلتی تھا جو چھوٹ کر چھجے پر گر پڑا۔ انیل کی نظر جب پوجا کے تھال اور جلتی پر پڑی تو دماغ ٹھنکا لگ گیا اسے زبردست صدمہ ہوا۔ اسے سمجھ میں آگیا کہ جس کی جان اس نے لینے کی

کوشش کی ہے وہ اس کی درازی عمر کے لئے کرڑا چوتھ کا برت کئے ہوئی تھی اور
چاند کو دیکھنے کے لئے چھجے پر آئی تھی۔ آخر وہ بھی انسان تھا اسے بڑی شرمندگی اور
افسوس ہوا۔ وہ جلدی سے پائپ کے سہارے نیچے پائیں باغ میں اترا۔ وہاں شانتی
بے ہوش پڑی تھی شانتی کو جلدی سے اٹھا کر کار میں رکھا اور سیدھے اسپتال گیا۔
کچھ دیر بعد شانتی کو ہوش آگیا اسے معمولی چوٹ آئی تھی۔ اور صدمہ سے بے ہوش ہوگئی
تھی۔ سامنے انیل کو دیکھا تو پوچھا کہ مجھے کیا ہوا تھا۔ انیل شرمندگی کی وجہ کر سچائی
بتانے سے ہچکچا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ تم چھجے پر گئی تھی تو پاؤں پھسل گیا۔ اور گر کر بے
ہوش ہوگئی تھی۔ تم نے شام میں جلد آنے کو کہا تھا اس لئے جب گھر آیا تو تم کو تلاش
کیا مگر تم نہ ملی تو باغ میں گیا وہاں تم کو بے ہوش پایا تب سب ماجرا سمجھ میں آگیا۔
شانتی سب سمجھتے ہوئے بھی دل ہی دل میں خوش تھی کہ اس کا سرتاج اسے واپس مل گیا
ہے تو شکوہ شکایت سے کیا فائدہ۔ اتنے میں نرس گرم گرم دودھ لے کر آگئی۔ لیکن
اس نے دودھ نہ پیا بولی ابھی تو میرا پوجا باقی ہے۔ چاند دیکھنے کے بعد ہی کچھ کھاؤں
پیونگی۔ وہ انیل کے ساتھ گھر گئی پوجا کا تھال پھر سے تیار کیا چھت پر چاند کو دیکھ
کر انیل کا پاؤں چھوئی۔ انیل نے اٹھا کر اسے گلے لگا لیا۔ کہا میری جان تمہاری جگہ
یہاں ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے دیوی جیسی بیوی کو نہیں
پہچان سکا۔ میں راہ سے بھٹک گیا تھا، تمہاری حق تلفی کی تھی۔ لیکن اب اس کا اعادہ
کروں گا۔ شانتی بولی آپ تو میرے دیوتا ہیں۔ میرا سؤرگ مجھے مل گیا مجھے اب اور کیا
چاہیئے۔ میری تپسیا سپھل ہوئی۔ وہ لوگ نیچے آئے اور کھانے کے میز پر بیٹھے ہی تھے
کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انیل نے فون اٹھایا تو نہاں کا فون تھا وہ انتظار کرتے
کرتے بور ہوگئی تھی تو دکان ہی سے فون کیا تھا۔ نہاں نے کہا ڈارلنگ اتنی دیر کیوں
کردی مجھے کافی بور کر دیا۔ جلدی آؤ، دوسری طرف انیل نے جواب دیا۔ نہاں!

اب میں کبھی نہیں آؤں گا۔ نیرا، میرا رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ میں اندھا ہو گیا تھا۔ شانتی نے میری آنکھیں کھول دی ہے۔ میں اپنے سورگ میں لوٹ آیا ہوں۔ اب بھول کر بھی میری شانتی تنگ نہ کرنا، مجھے بھول جاؤ اور اپنی زندگی آباد کر لو۔ یہ کہتے ہوئے انیل نے فون بند کر دیا۔ دونوں میاں بیوی اطمینان سے کھانا کھا کر اپنے کمرے میں سونے چلے گئے۔ صحیح معنوں میں ان کی زندگی کی آج پہلی رات تھی۔

———•ح•———

آئیڈیل

سومن سائیکل پر کام کی تلاش میں گھر سے نکل پڑا۔ وہ سائیکل چلا رہا تھا مگر اس کا دھیان اپنے گھر کی پریشانیوں کی طرف تھا۔ دو کنواری بہنیں تھیں۔ ایک چھوٹا بھائی تھا جو ابھی پڑھ ہی رہا تھا۔ باپ بوڑھے تھے اور بیمار بھی۔ ماں ہی تھی جو گھر چلا رہی تھی۔ محلے سے کپڑا لاتی اور سِل کر واپس کرتی اس سے جو پیسہ ملتا اسی سے گھر کا خرچ کسی طرح پورا ہوتا تھا۔ اس نے ایک دو ٹیوشن کر رکھا تھا جس سے اس کا پاکٹ خرچ نکلتا تھا۔ سومن کو بی۔ اے پاس کئے دو سال ہو چکا تھا۔ دفتروں کا چکر کاٹتے کاٹتے پریشان ہو چکا تھا۔ مگر ابھی تک روزگار کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ آج بھی ایک دفتر میں بلاہٹ تھی۔ وہیں جا رہا تھا۔ سومن اپنی سوچ میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ پیچھے سے آتی ہوئی کار کی ہارن کی آواز ہی سنائی نہیں پڑی۔ کار تیزی میں تھی۔ بریک لیتے لیتے کار سومن کے سائیکل سے ٹکرا گئی۔ سومن گر پڑا، کار رکی، کار ایک لڑکی چلا رہی تھی۔ اس نے کار سے اتر کر سومن کو سہارا دیکر اٹھایا۔ سومن کو کوئی خاص چوٹ نہیں لگی تھی۔ البتہ اس کے سائیکل کا رِم ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ لڑکی نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ میں ہارن بجا رہی تھی مگر آپ ہٹے ہی نہیں اس وجہ کر یہ حادثہ ہوا۔ سومن نے کہا غلطی آپ کی نہیں ہے میڈم! میں ہی کچھ سوچ رہا تھا۔

جس وجہ کر ہارن کی آواز سنائی نہیں پڑی۔ کوئی بات نہیں ہے مجھے زیادہ چوٹ
نہیں لگی ہے۔ کار والی لڑکی نے اپنے پرس سے ایک سو روپیہ کا نوٹ نکالتے ہوئے
سومن کی طرف بڑھا دیا۔" سائیکل مرمت کروالیں گے"، سومن نے کہا شکریہ!
اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک دو روپیہ ہی میں سائیکل ٹھیک ہو جائے گی۔ میں بنوا
لوں گا۔ آپ جائیں۔ لڑکی نے نوٹ واپس رکھ لیا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ VISITING
CARD نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا کہ کبھی کوئی ضرورت ہو تو بلا ہچک تشریف
لائیے۔ سومن نے کارڈ جیب میں رکھ لیا۔ اور اپنی سائیکل گھسیٹتا ہوا سڑک کنارے
سائیکل مرمت کی دکان پر پہونچا۔ دکان دار سائیکل مرمت کرنے لگا تو اسی بیچ اس
نے جیب سے کارڈ نکال کر پڑھنے لگا۔ اس پر لکھا تھا کماری سیما تاتیا ام ڈی، تاتیا
بلڈرس۔ تاتیا بلڈرس شہر کی مشہور تعمیراتی کمپنی تھی۔ بڑے بڑے تعمیری کام کے ٹھیکہ
لیا کرتی تھی۔ اتنے میں اس کی سائیکل ٹھیک ہو گئی۔ دکاندار نے کہا بابو آپ کی سائیکل
تیار ہے۔ ڈیڑھ روپے چارج ہوئے۔ سومن نے پیسہ دکاندار کو دیئے۔ کارڈ جیب
میں ڈالا۔ اور دفتر کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں بھی کسی پہونچ والے کے حصہ میں نوکری چلی
گئی۔ اسے نامراد گھر لوٹنا پڑا۔ وہ فرسٹ کلاس بی، اے تھا۔ شارٹ ہینڈ اور ٹائپ
رائٹنگ بھی جانتا تھا لیکن سب بیکار تھا، کوئی پیروی نہیں تھی اس لیئے وہ ابھی
تک نوکری کے لیئے چکر ہی کاٹ رہا تھا۔ اس طرح سے مہینوں بیت گیا مگر وہ بیکار کا
بیکار ہی رہا۔ ایک دن چکر کاٹتا ہوا اپنی سائیکل پر نوکری کی تلاش میں بھٹک رہا
تھا تو سامنے" تاتیا کمپلکس" کے بورڈ پر نظر پڑی تو اس نے سائیکل کو بریک لگائی
خیال آیا کہ کیوں نہ چل کر ملا جائے شاید کوئی کام مل جائے۔ اس نے سائیکل
اسٹینڈ پر سائیکل لگائی اور تاتیا بلڈرس کے دفتر میں جا پہونچا۔ ام ڈی کے چیمبر
کے آگے" مس سیما تاتیا" کا بورڈ لگا تھا۔ چپراسی کو سیما کے دیئے ہوئے وزیٹنگ کارڈ

کو دیتے ہوئے کہا کہ میڈم کو بولو کہ جس کو آپ نے یہ کارڈ دیا تھا وہ ملنے آئے ہیں۔ چپراسی نے نام پوچھا تو وہ بولا میرا نام سومن ہے۔ مگر میڈم میرا نام نہیں جانتی ہیں۔ چپراسی تعجب سے سومن کو دیکھتا ہوا کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔ واپس آکر سومن سے بولا جائیے میڈم آپ کو بلا رہی ہیں۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوا سامنے ریوالونگ چیئر REVOLIVING CHAIR پر سیما بیٹھی تھی۔ سومن کے اندر داخل ہوتے ہی بولی آئیے! بیٹھئے چائے وغیرہ پلایا۔ پھر پوچھا کیسے یاد کیا۔ سومن نے بہت ہچکچاہٹ کے ساتھ اپنا آنے کا مقصد بتایا۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا فی الحال میرے ایک اسٹینوکم ٹائپسٹ کی جگہ خالی ہے۔ آپ اگر پسند کریں تو آپ کو مل جائے گی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھ، وہ تیار ہو گیا۔ اس نے کمپنی کے سب سے اہم محکمہ میں اسٹینوکم ٹائپسٹ کا کام سونپا گیا تھا۔ یہی محکمہ ٹنڈر تیار کر کے داخل کرتی تھی۔ ٹنڈر کھلنے تک اسے راز میں رکھا جاتا ہے۔ اس محکمہ میں لوگوں کو بہت جانچ پرکھ کر انتہائی قابل اعتماد ہونے پر رکھا جاتا تھا۔ پوری کمپنی کا دارومدار اسی پر تھا۔ اگر ٹنڈر نہ ملتا تو کمپنی کا کام ہی بند۔ کیونکہ ٹنڈر کا راز کھلنے پر دوسرے کمپنی والوں کو پتہ چل جاتا اور وہ اس سے کم رقم پر ٹنڈر بھر دیتے۔ اور ٹھیکہ انہیں مل جاتا۔ سیما کم سے کم منافع پر ٹھیکہ لیتی تھی اور کام پوری ایمانداری سے اسٹیمیٹ (ESTIMATE) اور پلان کے مطابق کر دا ... ہی وجہ ہے کہ اس کی کمپنی نے ترقی کی تھی۔ اور اس کا بہت ساکھ اور نام تھا۔ کمپنی میں سبھی کو تعجب تھا کہ نئے آدمی کو اتنے اہم محکمہ میں کیسے رکھ لیا گیا۔ سیما کے والد سکھی چند نے بھی بیٹی سے کہا کہ نئے آدمی کو اس محکمہ میں مت رکھو۔ مگر وہ بولی پاپا وہ آزمودہ ہے۔ بڑا نیک، ایمان دار اور خود دار آدمی ہے۔ سکھی چند بولے بیٹی جیسا تم مناسب سمجھو۔ انہوں نے اپنی بیماری کی وجہ کر کمپنی کا سارا بوجھ اپنی اکلوتی بیٹی سیما پر ہی ڈال دیا تھا۔ لیکن سیما ہر بات میں باپ سے مشورہ کرتی تھی۔ سکھی چند کو بھی اپنی بیٹی کی قابلیت پر پورا بھروسہ تھا۔

انہیں دنوں ایک کروڑ روپیہ کا ٹنڈر نکلا۔ اس میں کافی منافع کی امید تھی۔

تاتیا بلڈرس کا ٹنڈر تیار ہونے لگا۔ تاتیا بلڈرس کی حریف کمپنی کامتا بلڈرس کے ام ڈی جیون کامتا اس فراق میں تھے کہ کسی طرح تاتیا کمپنی کے ٹنڈر کا پتہ لگ جائے تاکہ وہ اس سے کم رقم کا ٹنڈر بھر کر ٹھیکہ لے لیں اور مس سیما کو نیچا دکھا سکیں۔ جیون کامتا کے والد بین کامتا پہلے سکھی جند کے ساتھ پارٹنر تھے۔ سکھی جند چاہتے تھے کہ جیون اور سیما کی شادی ہو جائے۔ تاکہ پارٹنر شپ رشتہ داری میں بدل کر دوستی اور مستحکم ہو جائے مگر سیما کو یہ رشتہ منظور نہ تھا وہ چاہتی تھی کہ ایسے لڑکے سے شادی کرے جو دولت کا بھوکا نہ ہو۔ اور صحیح معنوں میں اس کی ذات سے محبت کرے۔ اس کا آئیڈیل اسے ابھی تک نہ مل سکا تھا۔ انہیں باتوں کو لے کر دونوں پارٹنر میں رنجش ہو گئی دونوں الگ الگ ہو کر اپنا کاروبار چلانے لگے۔ جیون ہمیشہ اس کوشش میں رہتا کہ سیما کو زک پہونچائے اسے یہ سنہرا موقعہ دکھائی پڑا۔ اس نے سومن کو شیشہ میں اتارنے کی کوشش کی۔ اسے ایک لاکھ روپیہ نقد دینے کا وعدہ کیا۔ مگر سومن اس کے لئے تیار نہ ہوا۔ الٹا اس نے یہ تمام باتیں سیما کو بتا دیں۔ سیما سومن سے بہت خوش ہوئی۔ اپنے والد سے اس کا ذکر کیا۔ سیما کی نظروں میں سومن کی وقعت اور بڑھ گئی۔ لیکن جیون کہاں چین سے بیٹھنے والا تھا۔ اس نے سیما کو اغوا کرنے کا پروگرام بنایا۔ وہ جانتا تھا کہ سیما اکیلے چلتی ہے۔ باڈی گارڈ بھی ساتھ نہیں لیتی۔ حالانکہ اس کے والد نے کئی بار اس کو ٹوکا بھی تھا۔ مگر وہ یہ کہکر ٹال گئی کہ اس کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ باڈی گارڈ لینے سے خود اعتمادی میں کمی آتی ہے۔

ایک دن جیون اپنی سازش کے مطابق اپنے گرگوں کے ساتھ سیما کی کار کا پیچھا کرتا ہوا سنسان علاقے میں پہونچ گیا۔ وہاں سیما کی کار کو اوورٹیک کر کے گھیر لیا۔ سیما کو نشہ والا کپڑا سونگھا کر بے ہوش کر دیا اور اسے اغوا کر کے ایک نامعلوم جگہ پر چھپا دیا۔ اس کے بعد سیما کے باپ کو فون کیا کہ بیٹی کو زندہ سلامت چاہتے ہو تو ٹنڈر کی کاپی کے ساتھ میری بتائی ہوئی جگہ پر آنا ہوگا۔ دو گھنٹہ کا موقعہ دیتا ہوں سوچ لو پھر دو گھنٹہ بعد فون کرونگا۔

سکھی چند نے کمپنی کے عہدے داروں کو بلایا ان لوگوں سے مشورہ کیا۔ سومن نے رائے دی کہ ٹنڈر سیما کی زندگی سے قیمتی نہیں ہے ٹنڈر کی کاپی دے کر اسے چھڑا لیا جائے۔ بعد میں پھر دیکھا جائے گا۔ سب نے سومن کی بات سے اتفاق کیا۔ اتنے میں پھر فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سکھی چند نے فون اٹھایا، ادھر سے جیون کا ہی فون تھا۔ سکھی چند نے ٹنڈر کی کاپی دینا منظور کر لیا۔ جیون نے بتایا کہ شہر سے باہر کھنڈر میں وہ سیما کے ساتھ اس کے آدمی کا ۱۲ بجے رات میں انتظار کرے گا۔ کالے بریف کیس میں لے کر ٹنڈر کی کاپی آئے گا اس نے متنبہ کیا کہ اگر کوئی چالاکی کرنے کی کوشش کی تو سیما کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اس کے بعد فون بند ہو گیا۔ سکھی چند نے بھی رسیور رکھتے ہوئے سب سے رائے لی کہ ٹنڈر کی کاپی لے کر کون جائے گا؟ مگر سب چپ رہے۔ تبھی سومن بول پڑا، کہ ٹنڈر لے کر میں جاؤں گا۔ سکھی چند راضی ہو گئے۔

سومن کالے بریف کیس میں ٹنڈر کی کاپی لے کر کھنڈر کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے اپنے دوست اور تھانے کے انسپکٹر سے مل کر سبھی تیاری کر لی۔ کھنڈر کو پولس نے شام ہی سے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ سبھی پولس والے جھاڑیوں میں چھپے ۱۲ بجے رات کا انتظار کر رہے تھے۔ ٹھیک ۱۲ بجے رات میں سومن کالے بریف کیس کے ساتھ کھنڈر میں داخل ہوا۔ سامنے دیکھا کہ جیون سیما کے ساتھ موجود ہے۔ اس نے بریف کیس زمین پر رکھ دینے کو کہا سومن نے ویسا ہی کیا۔ جیون ریوالور دکھاتے ہوئے آگے بڑھا اور بریف کیس اٹھا کر ریوالور دکھاتے ہوئے بھاگنے لگا۔ سیما کو وہیں چھوڑ دیا۔ مگر ریوالور کا رخ سیما ہی کی طرف تھا۔ جیسے ہی جیون کھنڈر سے باہر نکلا سیما دوڑ کر سومن سے لپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ جیون کے باہر نکلتے ہی پولس نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس نے گولی بھی چلائی مگر پولس کی گولی اس کے ہاتھ میں لگی اور ریوالور چھوٹ کر اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا وہ بھاگنا چاہتا تھا مگر پولس انسپکٹر نے اسے آدبوچا۔

اور گرفتار کر لیا۔ اتنے میں سکھی چند بھی اپنی بیوی کے ساتھ وہاں پہونچ گئے۔ سیما کو گلے لگا کر بہت روئے انہوں نے سومن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا بیٹے تمہاری عقلمندی اور بہادری سے سیما کی جان بھی بچ گئی اور ٹنڈر بھی محفوظ رہا۔ میں آج سے تمہیں اس کمپنی کا جنرل منیجر بناتا ہوں۔ سیما نے ان کی باتوں میں لقمہ دیتی ہوئی بولی اور داماد بھی۔ سکھی چند تعجب سے سیما کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے کہا ہاں پاپا! سومن ہی میرے آئیڈیل ہیں۔ انہیں میری دولت سے نہیں مجھ سے محبت ہے۔ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے بچایا ہے سومن نے تشکرانہ لہجہ میں کہا یہ تو میرا فرض تھا۔ اگر میری جان بھی چلی جاتی تو کم تھا۔ تینوں کار میں بیٹھ کر گھر روانہ ہوئے۔ جیون کو پولس نے ہتھکڑی لگا کر گاڑی میں تھانہ لے گئی۔ بعد میں اسے قید کی سزا ہو گئی۔ سیما اور سومن کی شادی دھوم دھام سے انجام پا گئی۔

—— ۰ ——

اصلی، نقلی

شکیلہ سانولے رنگ کی اچھے ناک نقشہ والی نیک سیرت لڑکی تھی۔ اسکی منسوب بچپن سے اس کے خالہ کے لڑکے جاوید سے طے تھی۔ جاوید نئے دور کا دلدادہ تھا۔ اسے گوری چمڑی والی فیشنبل لڑکی پسند تھی۔ مگر دونوں خاندانوں کے دباؤ کے آگے مجبور ہو کر اسے شکیلہ کے ساتھ شادی کرنی پڑی۔ شکیلہ بڑی وفاشعار بیوی ثابت ہوئی۔ دن رات سب کی خدمت کرتی۔ پورا گھر اس نے سنبھالا ہوا تھا۔ ساس کو کوئی کام نہ کرنے دیتی بلکہ اُلٹا سوتے وقت ساس کا پاؤں دباتی۔ سسر کو صبح سویرے چائے اور اخبار دینا، شوہر کو دفتر جانے کے لئے تیار کرانا۔ اس کے بعد سارے گھر کی صفائی، ناشتہ، کھانا تیار کرنا، کپڑا دھونا، آئرن کرنا یہ سب اسی کا کام تھا۔ سسر ساس ایسی بہو پا کر بہت باغ باغ تھے۔ مگر شوہر کو وہ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی خوش نہ کر سکی۔ وہ خدا کے بخشی ہوئی رنگ کو کیسے بدل ڈالتی ہمیشہ درست لباس، صاف ستھرا رہنے کی کوشش کرتی۔ مگر جاوید تھا کہ اپنے دفتر میں کام کرنے والی راحیلہ کی تعریف کرتا رہتا۔ کبھی اس کے بالوں کی، کبھی اس کے بات کرنے کی، کبھی چلنے، کبھی اس کے ذوق کی۔ بے چاری شکیلہ تو دن رات چکی کی طرح پستی رہتی۔ اسے ان باتوں کے لئے فرصت ہی کہاں تھی۔ دھیرے دھیرے جاوید

شکیلہ سے دور ہوتا گیا۔ اور راحیلہ کے قریب آتا گیا۔ دفتر اور دفتر کے باہر دونوں ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ راحیلہ کے گھر میں سوائے ایک چھوٹا بھائی کے اور کوئی نہ تھا۔ اس کے ماں باپ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ چھوٹا بھائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ راحیلہ پوری طرح آزاد تھی۔ جاوید اپنی کمائی پوری طرح راحیلہ پر لٹانے لگا۔ گھر میں نام کے لئے کچھ رقم دے دیتا۔ والد کے پنشن اور کھیت کی آمدنی سے گھر کا خرچ چل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ تو نوبت یہاں تک آگئی کہ وہ اب گھر بھی کبھی کبھی آنے لگا۔ اس کے والد کو کچھ بھنک لگی۔ ٹوک ٹاک کیا۔ ایک دن تو کافی بگڑے بھی۔ تو اس کا اثر الٹا ہی ہوا۔ بجائے سدھرنے کے وہ اور بگڑ گیا۔ گھر آنا ہی چھوڑ دیا۔ شکیلہ نے بہت رو دھو کیا تو سسر نے بہت تلاش کیا آخر میں وہ راحیلہ کے گھر ملا۔ باپ کے بہت بولنے پر پھر اجبراً گھر آیا۔ دو چار روز کچھ ٹھیک رہا پھر وہی حالت۔ شکیلہ رو رو کر ہلکان ہوتی۔ سسر بہت سمجھاتے کہ بیٹی میں تمہیں بیاہ کر لایا ہوں۔ اس کمبخت کی فکر کیوں کرتی ہو؟ اسے تمہاری ذرہ برابر پرواہ نہیں تو پھر تم اس کی فکر میں کیوں دبلی ہوتی ہو؟ ساس، سسر ہر طرح سے اس کی دلجوئی کرتے۔ مگر شکیلہ کو تو یہ زخم دھیرے دھیرے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ ادھر جاوید ان سب سے بے فکر اپنی دنیا میں مگن تھا۔ اور سیر و سپاٹا، دفتر کے بعد سینما، کلب، شاپنگ۔ بس وہ تھا اور راحیلہ اس کی زندگی اسی میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

اچانک شہر میں وبا پھیلی، لوگ چیچک کے شکار ہونے لگے جاوید بھی اس موذی مرض میں گرفتار ہو گیا۔ شروع شروع میں تو راحیلہ نے کچھ خدمت کی۔ مگر جب اس کا چہرہ اور بدن پھپھولوں سے بھر گیا تو اسے اسپتال میں داخل کرا دیا راحیلہ کو ڈر ہوا کہ چھوت کی بیماری اسے اور اس کے بھائی کو نہ لگ جائے اسپتال میں داخل کرانے کے بعد وہ گھوم بھی اسے دیکھنے نہ گئی۔ اسپتال والوں نے کسی

تیمار دار کو لانے کے لئے کہا تو اسے گھر کا پتہ بتانے میں بڑی شرمندگی لگی۔ جس گھر کو وہ بھول چکا تھا گھر والوں کی گھوم کر بھی خیریت دریافت نہ کی تھی انہیں بلانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ ڈاکٹروں کے ضد پر اس نے گھر کا پتہ بتایا۔ جب اس کے گھر یہ خبر ہوئی تو اس کے والد نے جانے سے انکار کر دیا۔ اور بیوی اور بہو کو بھی جانے سے منع کر دیا۔ ماں کی ماممتا کہاں ماننے والی تھی شکیلہ کو تو اپنا سہاگ لٹتا ہوا نظر آیا۔ دونوں ساس بہو نے رو رو کر جاوید کے باپ کے ناک میں دم کر دیا۔ آخر وہ اس بات کے لئے راضی ہوئے کہ ساس بہو جائیں مگر وہ خود نہیں گئے۔ دونوں ساس بہو اسپتال پہونچیں وہاں جاوید کی حالت غیر پایا ڈاکٹروں نے اسے گھر لے جانے کی صلاح دی اور بتایا کہ گھر پر بہتر دیکھ بھال ہو سکے گا۔ وہ لوگ ایمبولینس پر لے کر جاوید کو گھر آئیں وہ تو لگ بھگ بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ آٹھ، نو روز میں جا کر اس کا بخار کم ہوا۔ دھیرے دھیرے زخم مندمل ہو کر سوکھ گیا ایک ماہ ہوتے ہوتے وہ کہیں جا کر مکمل صحت یاب ہو سکا۔ اس دوران شکیلہ نے دن رات ایک کر کے اس کی خدمت کی۔ رات بھر وہ جاگتی رہتی۔ جاوید کہتا کہ سو جاؤ مگر وہ نہیں سوتی تھی کہ کب اسے کس چیز کی ضرورت ہو اور اس کی نیند نہ ٹوٹے۔ جاوید اس کی خدمت گزاری اور وفاشعاری دیکھ کر دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا۔ وہ سوچتا کہ اس نے اس کے ساتھ بے وفائی کی، اس کی تضحیک کی مگر وہ دل و جان سے اس کی خدمت کر رہی ہے اس نے راحیلہ کو ہیرا سمجھا تھا مگر وہ پتھر نکلی۔ اور شکیلہ جسے وہ پتھر سمجھ رہا تھا وہ ہیرا نکلی وہ نقلی چمک دمک اور گوری چمڑی کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ مگر سانولے رنگ کے پیچھے چھپے درد مند اور وفاشعار دل کو وہ پہچان نہ سکا۔ وہ اپنے کئے پر بڑا پشیمان تھا۔ اسے اچھی صورت اور اچھی سیرت میں فرق معلوم ہو گیا تھا۔ پوری طرح صحت مند ہونے کے بعد وہ آج پہلی بار دفتر جا رہا تھا وہ تیار ہو کر آئینہ کے سامنے گیا تو اپنی صورت کو دیکھ کر اسے بڑا خوف لگا۔ چیچک نے اس کے سارے چہرہ کو بگاڑ دیا تھا۔ ایک آنکھ پر تو اثر ہوا ہی تھا۔

وہ سوچنے لگا جس صورت پر اسے اتنا گمان تھا وہ صورت کہاں گئی ؟ وہ شکیلہ کے سانولے رنگ سے نفرت کرتا تھا اب تو اس کی اپنی ہی صورت بدل گئی تھی۔ جسے دیکھ کر اسے خود گھن آ رہا تھا۔ تو دوسرے پر کیا اثر ہوتا۔ وہ بہت شرمندگی اور احساس کمتری لئے دفتر گیا۔ سب سے پہلے راحیلہ پر نظر پڑی ہیلو کہہ کر اسے مخاطب کیا مگر راحیلہ کی نظر جب جاوید کے چیچک زدہ پر پڑی تو اس نے حقارت سے منھ پھیر لیا۔ یہ دیکھ کر جاوید کو بڑا صدمہ پہونچا۔ اسے اب پوری طرح احساس ہو چکا تھا کہ دنیا میں اچھی صورت کوئی چیز نہیں ہے سب صورت خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ اچھی چیز نیک سیرت ہے وہ اپنے کام میں دن بھر مشغول رہا۔ شام میں گھڑی دیکھی تو پانچ بج چکے تھے۔ اچانک تاریخ پر نظر پڑی تو دیکھا آج ۲۲ جون ہے۔ اسے یاد آیا کہ آج تو اس کی شادی کی سالگرہ ہے۔ وہ جھٹ پٹ بازار گیا۔ شکیلہ کے لئے ایک اچھی سی ساڑی خریدا اور مٹھائی لیا اور سیدھے گھر پہونچا۔ شکیلہ کے ہاتھ میں پیکیٹ تھماتے ہوئے بولا جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ شکیلہ جاوید کے بدلاؤ پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے بولی آج کیا بات ہے ؟ اس نے کہا ارے تمہیں یاد نہیں آج ہم لوگوں کی شادی کی سالگرہ ہے تم جلدی سے تیار ہو جاؤ ہم لوگ سینما چلیں گے۔ اور آج سے نئی زندگی شروع کریں گے۔ امید ہے کہ تم میری پچھلی غلطیوں کو معاف کر دو گی۔ شکیلہ نے اس کے منھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا آپ ایسا نہ بولیں۔ آپ تو میرے مجازی خدا ہیں راہ سے بھٹک گئے تھے خدا نے آپ کو راستہ دکھایا اس کا احسان ہے جاوید نے کہا مجھے راستہ پر لانے والی تم ہو۔ خدا کی تو مہربانی ہے ہی مگر تمہارے صبر، خدمت اور ایثار نے مجھے راہ راست دکھایا۔ اصلی اور نقلی کا پہچان آ گیا وہ شکیلہ کا پاؤں چھونے جا رہا تھا کہ شکیلہ اس کے گلے لگ گئی اور بولی میرے سرتاج آپ کی جگہ وہاں نہیں یہاں ہے دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور ان آنسوؤں میں سب گلے شکوے بہہ گئے شکیلہ اور جاوید تیار ہو کر والدین کے پاس آئے انہوں نے دونوں کو درازی عمر کی دعائیں دیں اور دونوں خوشی خوشی روانہ ہوئے۔

سراب

نائلہ کا خاندان مذہبی تھا۔ سبھی صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ پردہ کا بھی رواج تھا۔ مگر لڑکیوں کو کوئی قید میں نہیں رکھا جاتا تھا۔ انہیں پڑھنے، لکھنے اور گھومنے پھرنے کی چھوٹ تھی جب نائلہ نے میٹرک پاس کیا تو کالج میں داخلہ کا سوال آیا اس کا چچیرا بھائی زاہد شہر میں پہلے ہی سے پڑھ رہا تھا اسی کے ساتھ نائلہ کو شہر بھیجا گیا۔ کالج میں داخلہ ہو گیا اور ہوسٹل میں جگہ بھی مل گئی۔ نائلہ برابر زاہد سے ملا کرتی۔ لوکل گارجین کی حیثیت سے زاہد بھی اس کے ہوسٹل میں جا کر خیریت دریافت کرتا رہتا تھا۔ چھٹیوں میں دونوں ساتھ ساتھ گھر آتے اور پھر فرصت ختم ہونے پر ساتھ ساتھ واپس جاتے۔ نائلہ کو شہر کا رنگ ڈھنگ شروع شروع میں عجیب لگا۔ لیکن دھیرے دھیرے اس پر شہری لڑکیوں کا اثر ہونے لگا انہیں کے ایسا پہناوا اور رہن سہن سیکھ لیا۔ مگر جب گھر جاتی تو اسی ماحول میں رہتی۔ اسی لئے اس کے والدین کو اس کی تبدیلی کا اندازہ ہی نہ ہوا۔ گھر پر وہ پنج وقتی نمازی تھی مگر ہوسٹل میں وہ سب کچھ چھوٹ گیا۔ شروع شروع میں تو وہ ہوسٹل میں نماز پڑھتی تھی مگر ایک دو بار لڑکیوں نے مولون کہہ کر مخاطب کر دیا تو نماز ہی چھوڑ دیا۔ جب بی اے پاس کرنے کے بعد وہ گھر لوٹی تو اس کا رنگ ڈھنگ ہی بدل چکا تھا۔ وہ گاؤں والی نائلہ نہیں رہ گئی تھی۔ اس کا طور طریقہ اور مزاج سب شہری لڑکیوں جیسا ہو گیا تھا، زاہد کا بھی ایم اے

کا امتحان ہو گیا تھا دونوں گاؤں ساتھ ساتھ واپس ہوئے اتنے دنوں کے میل ملاپ میں نائلہ اندر اندر ہی زاہد کو چاہنے لگی تھی۔ زاہد کا رہن سہن بھی شہر میں رہنے کی وجہ کر بدل گیا تھا۔ مگر زاہد نے نائلہ کی طرف اس حیثیت سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ صرف یہی سمجھتا تھا کہ وہ نائلہ کا بڑا بھائی اور رگار جبین ہے۔

گھر واپس ہوتے ہی نائلہ کی شادی کا چرچا ہونے لگا گھر کے ماحول کی وجہ کر اس کی یہ ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ زبان پر زاہد کا نام لائے۔ نائلہ کی منسوب بچپن ہی سے اس کے ماموں کے لڑکے راشد سے طے تھی۔ ایک روز دیکھا کہ اس کے ماموں پہونچے ہوئے ہیں گپ شپ، باتیں ہوئیں پھر شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ نائلہ کی جرأت انکار کرنے کی نہ ہو سکی اور وہ راشد سے بیاہ کر چلی گئی۔ راشد ایک خوبرو اور پڑھا لکھا آدمی تھا۔ کسی دفتر میں ملازمت کرتا تھا مگر اس کا گھرانہ بھی مذہبی تھا سبھی نماز روزہ کے پابند تھے۔ عورتوں کو بے جا آزادی نہیں تھی۔ بہت زیادہ فیشن پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر سنگار پٹار پر کوئی روک ٹوک نہیں تھا۔ ہاں نماز نہ پڑھنے پر سرزنش ضرور ہوتی تھی۔ نائلہ کی طبیعت ایک ذرا سسرال میں نہیں لگتی تھی۔ چار پانچ سال شہر میں رہنے کے بعد اور شہری لڑکیوں کی صحبت کی اثر سے وہ دماغی طور پر بالکل ہی بدل چکی تھی۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ اپٹوڈیٹ شہری بابو تھا۔ نہ کہ راشد جیسا سیدھا سادا مسلمان۔ اسے راشد کی کوئی ادا نہ بھاتی۔ وہ ہمیشہ اس کے ہر بات پر تنقید کرتی رہتی۔ زبردستی پائجامہ کرتا کے بدلے اسے پینٹ شرٹ پہنایا۔ بال کا اسٹائل بدلوایا۔ تھوڑا بہت تو راشد بیوی کی دلجوئی کے لئے جیسا کہتی کر لیتا۔ مگر جب برداشت سے باہر ہونے لگا تو ان بن شروع ہو گئی وہ چاہتی تھی کہ بنا برقعہ کے راشد کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھ کر گھومنے جائے۔ راشد کے یہاں یہ معیوب مانا جاتا تھا۔ اس نے بال کٹوانا چاہا تو منع کر دیا گیا۔ ہمیشہ سینما جانے پر روکا گیا تو اسے یہ بھی پسند نہ آیا۔ نائلہ کو یہ سب پسند نہ آیا نوبت لڑائی جھگڑا تک

پہنچ گئی۔ ایک روز وہ دیور کے ساتھ بنا برقع کے جانا چاہ رہی تھی تو سسر نے برقعہ پہننے کے لئے کہا۔ اس پر تنک کر وہ کپڑا اتار کر بیٹھ گئی اور بازار ہی نہیں گئی۔ رات میں شوہر کے ساتھ خوب لڑائی ہوئی اس نے غصہ میں راشد کو بہت برا بھلا کہا اس نے کہا کہ میں نہیں جانتی تھی کہ تم پڑھ لکھ کر کے اتنے گنوار اور دقیانوسی ہو۔ میں جانتی تو شادی سے انکار کر دیتی ایک زاہد ہے کتنا ہینڈسم اور مہذب ہے راشد کو تو بہت برا لگا مگر وہ غصہ پی کر رہ گیا دوسرے روز صبح سویرے نائلہ اپنا سوٹ کیس ٹھیک کر کے شوہر سے بولی کہ میں میکہ جارہی ہوں تمہارے ساتھ میرا گزارہ ہونا مشکل ہے میری زندگی جہنم ہو کر رہ گئی ہے۔ کیا کیا ارمان لے کر آئی تھی میرے سارے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔ شوہر نے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر اس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنے فیصلہ پر اٹل رہی۔ راشد نے کہا نائلہ ابھی تم غصے میں ہو جب غصہ اتر جائے تو ٹھنڈے دل سے سوچنا اور اس گھر کا دروازہ ہمیشہ تمہارے لئے کھلا ہوا ہے۔ جب جی چاہے لوٹ آنا۔ سسر نے کہا کہ دیور کو ساتھ لیتی جائے مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ اکیلے ہی اپنا سوٹ کیس لے کر میکہ روانہ ہو گئی۔ جب میکہ پہونچی تو اس کا غصہ کچھ کم ہوا۔ میکہ والوں کو بڑا تعجب ہوا کہ بنا خبر کے اچانک کیسے آ گئی۔ پوچھنے پر بہانہ بنا دیا کہ ایسے ہی طبیعت نہیں لگ رہی تھی تو چلی آئی۔ مگر دوسرے روز سسر نے دیور کو بھیجا۔ ساتھ میں سمدھی کے نام خط تھا جس میں سب احوال لکھا تھا۔ تب گھر والوں کو حقیقت معلوم ہوئی۔ سسر نے بھی لکھا تھا کہ نائلہ کے لئے اس کے سسرال کا دروازہ کھلا ہے۔ جب چاہے چلی آئے۔ ماں باپ نے بہت سمجھایا مگر وہ جانے کے لئے تیار نہیں ہوئی۔ ماں نے کہا کہ ابھی چھوڑ دیں۔ کچھ دنوں کے بعد جب غصہ کم ہو گا تو وہ خود ہی جانے کو تیار ہو جائے گی۔

مگر نائلہ تو تہیہ کر کے آئی تھی کہ وہ اپنے خوابوں کے شہزادہ زاہد کو اپنائے گی۔ اور راشد سے طلاق لے لیگی۔ وہ پہلے زاہد کا عندیہ لینا چاہتی تھی۔ ایک دن اس کا

موقعہ مل گیا۔ زاہد اس سے ملنے چلا آیا، گھر میں کوئی نہ تھا۔ سب کسی تقریب میں گئے تھے۔ زاہد سے ادھر ادھر کی باتیں ہونے کے بعد اس نے اپنے دل کی بات زاہد سے کہہ دی۔ زاہد اچانک یہ سب باتیں سن کر سکتہ میں آگیا۔ پھر ہوش یکجا کر کے نائلہ سے بولا۔ بہن! تم مسلمان لڑکی ہو، تمہاری شادی راشد سے ہو چکی ہے کوئی بھی شادی دو خاندانوں کا ملن ہوتا ہے۔ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کو پہچاننا ہوگا۔ دونوں کو کچھ نہ کچھ ایڈجسٹ (ADJUST) کرنا ہوگا۔ تبھی یہ گاڑی چل سکیگی۔ اگر تم راشد سے نباہ نہ کر پائی اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تمہارا نباہ میرے ساتھ ہو سکے گا۔ انسان کو ہر ماحول میں گھل مل کر رہنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مذہبی ماحول میں برائی کیا ہے نماز روزہ کرنا کیا برا ہے؟ ہم لوگوں کا ماحول بھی تو مذہبی ہے اگر تمہاری شادی میرے ساتھ بھی ہوتی تو تمہیں اس سے زیادہ آزادی نہیں مل پاتی۔ وہاں بھی تمہیں قید نہیں ہے کہیں آنے جانے پر روک نہیں ہے۔ ہاں! مسلمان بہو بیٹی سا برتاؤ کرنا ہے۔ تو یہ راستہ صحیح ہے۔ میں بھی اپنی بیوی سے یہی چاہوں گا۔ تمہاری جانکاری کے لئے میں بتادوں کہ میری شادی بھی میرے والدین نے طئے کردی ہے۔ اگلے ہفتہ ۱۰ تاریخ کو شادی ہے۔ نائلہ کو یہ سن کر جھٹکا لگا۔ جس تنکے کو پکڑنے وہ اپنی ناؤ سے کود پڑی تھی اس نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں مگر اب وہ کیا کرے اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ زاہد کب چلا گیا کہ اسے پتہ بھی نہ چلا۔ اب وہ ماں باپ کو بھی یہ کہنے میں شرم محسوس کر رہی تھی کہ وہ سسرال جائیگی پہلے ہی ان لوگوں کی بات نہیں مانی تھی۔

اگلے ہفتہ زاہد کی شادی ہوگئی۔ دلہن بھی آگئی۔ گھر والوں نے ضد کی کہ جاکر زاہد کی دلہن کو دیکھ آؤ۔ وہ تھراً جبراً زاہد کی دلہن کو دیکھنے گئی۔ دلہن سے بات چیت کر رہی تھی کہ مغرب کی اذان ہوگئی، دلہن نے کہا نائلہ بیٹھو میں نماز پڑھ کر آتی

ہوں یہ سنکر نائلہ کو بڑی شرمندگی لگی۔ اس نے کہا ابھی ابھی چلیں میں بھی نماز پڑھوں گی۔
دونوں نے وضو کیا اور نماز ادا کیا۔ رات بھر وہ سوچ فکر میں رہی۔ ٹھیک سے نیند بھی
نہیں آئی۔ آخر میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے شوہر کے یہاں لوٹ جائے گی۔ سویرے اٹھی
تو دیکھا کہ اس کا دیور آیا ہوا ہے۔ ساتھ میں سسر کا خط تھا۔ لکھا تھا کہ بیٹی اگر طبیعت
بھر گئی ہو تو چلے آنا۔ یہاں راشد کی طبیعت بھی کچھ گڑبڑ چل رہی ہے سبھی تمھارے
انتظار میں ہیں۔ اس نے جلدی جلدی اپنا سامان ٹھیک کیا۔ ماں کا برقعہ لے کر پہنا گھر
والوں نے دیکھا کہ وہ بالکل تیار ہے تو پوچھا کہ کہاں جارہی ہو؟ وہ بیباک سے بولی اپنے
گھر۔ والدین کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی وہ کچھ سہمی اور کچھ شرمندہ سی سسرال پہونچی۔ مگر
وہاں سب نے بڑی خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا رات میں شوہر سے اس نے
معافی مانگتے ہوئے کہا کہ میرے سرتاج! آپ میرے مجازی خدا ہیں۔ میری غلطیوں کو معاف
کر دیں میں سراب کے پیچھے دوڑ رہی تھی مگر میری منزل تو سامنے تھی۔ میں شہر کے چک
دمک میں اندھی ہو کر خدا اور اس کے رسول صلعم کی باتوں کو بھول گئی تھی۔ انجانے میں آپ
کو بہت برا بھلا کہا تھا۔ راشد نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا نائلہ! تمہیں اپنی غلطیوں
کا احساس ہو گیا یہ بہت بڑی بات ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اس گھر کا دروازہ
ہمیشہ تمہارے لئے کھلا ہوا ہے۔ تم بہت جلد واپس آگئی اس سے اور زیادہ خوشی
کی بات میرے لئے کیا ہو سکتی ہے۔ بیوی کے لئے شوہر کے گھر سے بہتر اور کوئی
جگہ نہیں۔ اور مسلمان کے لئے خدا اور اس کے رسول صلعم کے احکام کے ماننے سے
بہتر اور کوئی بات نہیں۔

—— ۰۰ ——

شیر دیوتا

اس جگہ آئے تین سال ہو چکے تھے۔ مگر ابھی تک رائے جاما گاؤں جانے کا
اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ایک تو راستہ اتنا دشوار گزار تھا کہ جیپ بھی لے جانے میں دقت
ہوتی تھی اور گاؤں چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ دوسرے وہاں کے
لوگ اتنا سادہ لوح اور سیدھے سادے تھے کہ کبھی کسی کام میں دقت ہی نہیں ہوتی تھی۔
کہ جانا پڑے۔ کئی بار وہاں جانے کا پروگرام بنا مگر عین وقت پر کوئی نہ کوئی کام آجانے کی
وجہ کر پروگرام ملتوی کرنا پڑا مگر علاقہ کے اس گاؤں میں جانا ضروری تھا تاکہ وقت ضرورت پر
اس گاؤں کے متعلق جانکاری رہے۔ اس لئے ہم لوگوں نے طئے کیا کہ خاص پروگرام بنا کر
رائے جاما چلا جائے سبھی عملہ کو آگاہ کر دیا گیا اور تاریخ کا تعین کر لیا گیا۔ جیپ کو اچھی
طرح سے چیک کرنے کے لئے ڈرائیور کو ہدایت دے دی گئی۔ مقامی تھانہ کے داروغہ
اور پولس فورس کو ساتھ چلنے کے لئے کہا گیا کیونکہ وہاں جنگل کی ناجائز کٹائی کرنے والے
جیپ دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ محکمہ جنگلات کے افسر انہیں پکڑنے آئے ہیں۔ اور وہ تیر کمان
لے کر حملہ کر دیتے ہیں کٹائی کرنیوالے باہر سے آتے ہیں اور جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔

ہم لوگ تاریخ معینہ پر اللہ کا نام لے کر جیپ پر سوار ہو کر روانہ ہوئے کل
ملا کر دس نفوس تھے۔ میں، داروغہ اور ان کے چار سپاہی مسلح اس کے علاوہ ڈرائیور،

یوں اور دیگر دو عملے تھے ۔ جیسے ہی شہر پار کر جنگل کے راستے پر پہونچے طبیعت کھل اٹھی ۔ ہر طرف سرسبز شاداب جنگل کبھی کبھی خرگوش، لومڑی وغیرہ سڑک پار کرتے دکھائی دیتے ۔ ایک تو موسم سہانا تھا اس پر یہ مناظر، دل باغ باغ ہو رہا تھا ہم لوگ نظارے میں اتنے مدہوش تھے کہ جب ڈرائیور نے اچانک گاڑی کو بریک لگایا تو ہم سبھی آگے کی طرف جھکتے چلے گئے ۔ اگر فوراً خود کو سنبھالا نہ ہوتا تو سر پہ چوٹ تک سکتی تھی ۔ گاڑی چرچرا کر رک گئی ۔ جب ہم لوگ سنبھلے تو دیکھا کہ چند قدم پر ہی ایک عورت گاڑی کے عین سامنے دونوں ہاتھ جوڑے کھڑی تھی مجھے وہ آدی باسی نہیں لگی ۔ گاڑی رکتے ہی وہ قریب آئی مجھ سے ہم کلام ہوتے ہوئے بولی صاحب ! اس دکھیاری کی کہانی سن لیں اور مدد کریں ۔ تاکہ مجھے چین نصیب ہو اور اپنے گھر واپس جا سکوں مجھے تجسس ہوا میں ہمہ تن گوش ہو گیا ۔ میں نے کہا میں تمہاری کہانی سنوں گا ۔ سپاہیوں کو جو کہ اسے بھگانا چاہتے تھے منع کیا کہ وہ ایسا نہ کریں ۔ اس نے اپنی داستان یوں شروع کی ۔

میں جنوبی ہند کے رہنے والی ہوں میرے شوہر مسٹر جارج رانچی میں مرکزی حکومت کے ایک دفتر میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے ۔ وہ شکار اور قدرتی نظاروں کے رسیا تھے ۔ کسی نے بھی ایسی جگہ کا ذکر کیا جو کہ قدرت کے نزدیک ترین ہو اور شکار کے لئے بھی موزوں ہو وہاں کا پروگرام بنا لیتے اور مع اہل خاندان روانہ ہوتے ۔ خواہ راستہ کتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو جگہ کتنی بھی خطرناک کیوں نہ ہو ۔ رائے جاما گاؤں میں ایک شیر نے ادھم مچا رکھا تھا ۔ محکمہ جنگلات کے لوگ اس پر قابو نہ پا سکے تو انہوں نے میرے شوہر کو بلا دیا کہ اس خونی شیر سے گاؤں والوں کو نجات دلائی جائے ۔ انہوں نے رائے جاما کے قدرتی حسن اور شکاری جانوروں کا ذکر سن رکھا تھا شیر کے شکار کا دعوت ملا ۔ تو انکار نہ کر سکے ۔ گھر آتے ہی رائے جاما کا ذکر کیا اور اگلے ہفتہ ہی یہاں آنے کا پروگرام بنا لیا ۔ ہمارا اکلوتا بیٹا مدراس میں پڑھ رہا تھا ۔ گھر میں دو ہی نفوس تھے اور تیسرا ہمارا

پالتو کتا ٹامی تھا۔ تاریخ معینہ کو ہم لوگ۔ اپنے سفری و شکاری سامانوں کے ساتھ سویرے اپنی گاڑی پر روانہ ہو گئے۔ دن ڈھلتے رائے جا پہونچے۔ خیمہ ڈالا، شام کی چائے پی۔ چراغ روشن کیا، پھر چہل قدمی کے لئے نکل پڑے یہ ایک، پوری طرح آدی باسی گاؤں ہے۔ چاروں طرف جنگل اور طرح طرح کے جانور آزادی سے ادھر ادھر گھومتے نظر آئے۔ نظارہ ہم لوگوں کو بہت ہی دلکش لگا۔ اکا دکا لوگ گھومتے نظر آئے گاؤں کے مکھیا کا گھر معلوم کر کے وہاں پہونچے۔ وہ بڑے ہی تپاک سے ملا۔ کافی خاطر تواضع کی۔ خاص قسم کا ہڑیا (چاول کا شراب) پلایا۔ اور کھانے کے لئے چاول کا موڑھی دیا۔ مکھیا سے آدم خور شیر کے بارے میں جانکاری چاہی اس نے بتایا کہ ہر اندھیری رات (اماوسیا) کو وہ شیر کسی کے دروازہ پر کھڑا دکھائی پڑتا ہے۔ اس کے بعد وہ گھر والا اگر گاؤں کے بھگتا (بھگت پوجاری) کے پاس جا کر پوجا پاٹ نہیں کراتا ہے تو دوسری اندھیری رات کو گھر کا ایک نہ ایک آدمی غائب ہو جاتا ہے اور پھر اس کی لاش ہی ملتی ہے۔ لوگ اس قدر خائف ہیں کہ ہر اندھیری رات کو ڈر کے مارے کسی کو نیند نہیں آتی ہے۔ جس کے گھر کے سامنے شیر نظر آتا ہے وہ صبح سویرے بھگتا کے یہاں پہونچکر پوجا پاٹ کا پورا خرچ اور مرغا شیر کے لئے بھینٹ دیتا ہے۔ ساتھ میں ہڑیا بھی۔ بھگتا نے شیر کی ایک مورتی بنا رکھی ہے اسی کے آگے پوجا کرتا ہے اور بعد میں سب چڑھاوا اسی کا ہو جاتا ہے۔ شیر کا پیچھا کرنے کی کوشش ایک دو آدمی نے کی مگر ان سب کا بھی لاش ہی ملا۔ محکمہ جنگلات کے عملوں کی بہت کوشش کے باوجود شیر کا پتہ نہیں چلا۔ تب ان لوگوں نے آپ کو بلایا ہے۔ مکھیا کی بات ختم ہوئی تو رات ہو چکی تھی۔ ہم لوگ اس سے اجازت لے کر اپنے خیمہ میں واپس آ گئے۔ ٹامی کو کھلا چھوڑ دیا۔ رات کا کھانا تیار کیا اور کھا کر ہم لوگوں سونے چلے گئے۔ ابھی نیند لگی تھی کہ ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے خیمہ کا دروازہ کھولا۔ ہم دونوں کی نیند ٹوٹ گئی۔ ایک شخص اندر داخل ہوا بہت سیدھا سادا تھا۔ اس نے میرے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا۔

زدہ خونخوار شیر اس کے خیمہ سے کچھ دور جھاڑی میں دکھائی دے رہا ہے۔ میرے شوہر فوراً تیار ہوئے اپنی رائفل لی اور اس کے ساتھ چل دیئے۔ مجھ سے کہا کہ خیمہ کا دروازہ ٹھیک سے بند کرلو۔ ٹامی باہر ہے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ صبح سویرے تک وہ نہ لوٹے تو مجھے فکر لاحق ہوئی۔ خیمہ سے باہر نکلی تو ٹامی کی لاش دیکھی۔ میں نے ایک آدمی جسے پانی لانے اور صفائی کرنے کے لئے مقرر کیا تھا اس کے معرفت مکھیا کو خبر کیا، مکھیا آیا۔ اس نے اپنے لوگوں کے ساتھ کافی کھوج بین کی مگر پتہ نہ چلا۔ وہ دن اور آج کا دن ہے کہ ابھی تک اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ پولس نے بھی کوئی کارروائی نہیں کی۔ شیر والا واقعہ ابھی تک دہرایا جارہا ہے۔ یہاں جو کوئی بھی آتا ہے اس سے گہار کرتی ہوں مگر کسی نے کوئی مدد نہیں کی۔ مکھیا سے معلوم ہوا کہ آج آپ آنے والے ہیں اسی لئے رات سے میں کھڑی تھی مکھیا نے بتایا ہے کہ آپ بہت رحم دل ہیں مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں اس لیئے ہاتھ جوڑ کر آپ سے بنتی کرتی ہوں کہ میرے شوہر کا پتہ لگا دیں۔ زندہ یا مردہ تاکہ مجھے چین آجائے اور میں گھر واپس چلی جاؤں اور اپنے بیٹے سے مل سکوں۔

میں نے اس عورت کو جیپ میں بیٹھالیا۔ اور ہم لوگ مکھیا کے یہاں پہونچے مکھیا نے بڑی آؤ بھگت کی۔ جاتے ہی ہم لوگوں کو پھولوں کے مالا سے لاد دیا۔ پھر ناشتہ چائے۔ اسے عملوں نے بتا دیا تھا کہ میں ٹھریا نہیں پیتا۔ مکھیا کے دروازہ پر کار کھڑی دیکھی تو تجسس ہوا، کار کا ٹائر پنکچر ہوچکا تھا اور رنگ و روغن خراب، میں نے مکھیا سے پوچھا کہ کار کس کی ہے؟ تو مکھیا نے بتایا کہ یہ گاڑی مسٹر جارج کی ہے اسی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی بیوی جوزیفر ہیں۔ مکھیا نے شیر والا واقعہ مختصر میں بتاتے ہوئے کہا کہ مسٹر جارج کے غائب ہونے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ انہیں گھر پہونچوا دیتا ہوں۔ مگر یہ راضی نہیں ہوئیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک جارج کو زندہ یا مردہ تلاش نہیں کرلوں گی واپس نہیں جاؤں گی۔ وہاں خیمہ میں اکیلے ان کا رہنا

مناسب نہ تھا۔ لہٰذا انہیں اپنے گھر لے آیا ایک علاحدہ کمرہ دے دیا ہے۔ ان کا سب سامان بھی انہیں کے ساتھ ہے۔ میں نے مکھیا سے دریافت کیا کہ آخر وہ شیر کہاں چلا جاتا ہے۔ پتہ کیوں نہیں چلتا؟ پہلے تو مکھیا ہچکچایا۔ پھر ہم لوگوں کے ضد کرنے پر اس نے سرگوشی کے انداز میں بتایا کہ جوزیفر کو بھگتا پر شک ہے۔ میں یقین کے ساتھ کچھ کہہ نہیں سکتا، لیکن ہو سکتا ہے، شیر وہی بھیجتا ہو۔ بھگتا کے خلاف کسی کو بولنے کی ہمت نہیں ہے گاؤں میں اس کا بڑا دبدبہ ہے۔ اس کی پہنچ شہر میں حکام تک ہے۔ گاؤں والوں پر اس کا رعب غالب ہے اور وہ لوگ بھگت جسے عام طور پر بھگتا کہتے ہیں اس پر آنکھ موند کر اعتماد کرتے ہیں۔ اس کی ہر بات کو لوہے کی لکیر مانتے ہیں۔ وہ لوگ یہ یقین کرتے ہیں کہ اس کی بات نہیں مانیں گے تو وہ جو کہتا ہے ہو کر رہے گا۔ وہی ہے جو شیر سے ان لوگوں کو بچاتا ہے اس کے دوسری تمام بیماریاں جسے وہ لوگ جادو سمجھتے ہیں اس کا علاج بھی بھگتا ہی کرتا ہے۔ کوئی اگر بھگتا کے خلاف ایک لفظ بھی بول دے تو وہ لوگ اس کی زبان کاٹ دیں گے۔ میں نے داروغہ جی سے کہا کیوں نہ ہم لوگ بھگتا سے مل کر سچائی کا پتہ کریں۔ پہلے تو داروغہ جی راضی نہ ہوئے پھر میرے ضد پر وہ تیار ہو گئے۔ مکھیا سہم گیا وہ جانے کو تیار نہ ہوا۔ میں، داروغہ جی، فورس اور عملوں کے ساتھ بھگتا کے یہاں جا پہونچے۔

ہم لوگوں کو دیکھ کر بھگتا پریشان سا ہو گیا۔ مگر وہ اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے بڑی خندہ پیشانی سے ملا۔ ہم لوگوں کو بٹھایا، شہر کی مٹھائیاں اور نمکین کھلایا۔ میں نے بات چیت کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے شیر والے واقعہ کے متعلق پوچھا۔ اس نے کہانی دہرائی۔ میں نے جارج کے متعلق پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ وہ شیر دیوتا کو ختم کرنے آیا تھا۔ وہ بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے ہی اسے آسمان پر بلا لیا۔ مجھے اس کی کہانی پر یقین نہ ہوا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم ہم لوگوں کو کٹیا دکھاؤ۔

مگر وہ راضی نہ ہوا۔ اس نے بہانہ بناتے ہوئے کہا کہ ابھی آپ لوگ آرام کریں۔ آج دیوتا کے آرام کرنے کا دن ہے اس لئے اندر کوئی نہیں جا سکتا۔ آج اگر رہیں تو کل دکھا دوں گا۔ مجھے دال میں کالا نظر آیا دیکھا کہ بھگت کسی بہانہ آج ہم لوگوں کو ٹالنا چاہ رہا ہے ضرور اندر کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے کہا مجھے اندر لے چلیں جو بھی دان دکھشا ہو گا دیں گے یہ سننا تھا کہ وہ بولا آپ لوگ ٹھہریں میں دیوتا سے اجازت لے کر آتا ہوں میں تاڑ گیا کہ وہ یہ سمجھ گیا ہے کہ ہم لوگ بنا اندر گئے ٹلنے والے نہیں ہیں۔ اس لئے یا تو وہ بھاگنا چاہتا ہے یا کچھ گڑبڑ ہے جسے ٹھیک کر وہ ہم لوگوں کو اندر لے جائے گا۔ میں نے آہستہ سے داروغہ سے کہا کہ اب کاروائی ضروری ہے۔ بھگتا کو جانے مت دیں اسے روکیں اور ہم لوگ اس کو ساتھ لے کر اندر چلیں۔ داروغہ نے فوراً فورس کو اشارہ کیا اور ان لوگوں نے بھگتا کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ میں نے بھگتا کو حکم دیا چلو ہم لوگوں کو اندر لے چلو۔ بھگتا اندر سے ڈرا ہوا تھا مگر بظاہر آنکھ لال پیلی کرتے ہوئے بولا۔ تم لوگ زبردستی نہیں کر سکتے۔ زبردستی کرو گے تو دیوتا کا عتاب تم لوگوں پر ہو گا۔ لیکن ہم لوگ اس کی گیدڑ بھبکی سے ڈرے نہیں۔ داروغہ نے زبردستی اس کو اندر چلنے کو کہا۔ ہم لوگ اندر گئے تو دیکھا کہ اس میں دھوپ وغیرہ جل رہا ہے۔ ایک چراغ روشن ہے اور شیر دیوتا کی ایک بہت بڑی مورتی ہے۔ اس کے پیچھے ایک چور دروازہ تھا۔ اسے کھول کر ہم لوگ اندر داخل ہو گئے۔ بھگتا چلاتا رہا، بابو ہاتھ جوڑتا ہوں اندر مت جاؤ۔ تم لوگ مصیبت میں پھنس جاؤ گے مگر ہم لوگ نہیں مانے۔ کمرا میں اندھیرا تھا۔ ٹارچ جلایا گیا تو وہاں کا منظر دیکھ کر ہم لوگ حیران رہ گئے۔ وہاں انسان اور شیر کا مکھوٹا اور شیر کی کھال چاروں طرف ٹنگی تھی۔ ایک بڑا بکس تھا جس میں روپیہ زیورات کا انبار تھا جو بھگتا لوگوں سے نذرانہ اور چڑھاوا کی شکل میں اینٹھا کرتا تھا۔ اس کمرا کے پیچھے بھی ایک چھوٹا دروازہ تھا۔ اسے کھول کر اندر گئے تو اور بھی حیرانی ہوئی وہاں

ایک شخص جو نہایت لاغر ہو گیا تھا۔ داڑھی برسوں سے نہیں بنی تھی ہاتھ پاؤں میں زنجیر بندھا پڑا تھا میں نے اس سے اس کا نام پوچھا تو وہ بولا جارج۔ اس کا نام سنکر مجھے سارا ماجرا سمجھ میں آگیا۔ داروغہ جی نے زنجیر کٹا پھر چوکیداروں کو بلایا گیا۔ بیل گاڑی پر بکس اور سب۔ کھال مکھوٹا وغیرہ لادیا گیا۔ بھگتا کو رسی سے باندھ کر جیپ پر بٹھایا گیا۔ مکھیا کے یہاں خبر کیا تو جوسیفر مکھیا کے ساتھ آگئی۔ وہ شوہر کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئی۔ دونوں گلے لگ کر خوب روئے۔ ایک سپاہی کو شیر کی مورتی کے نیچے جارج کی رائفل بھی مل گئی۔ جارج کا سارا سامان بھی ایک بیل گاڑی پر ڈالا گیا اور دونوں بیل گاڑی کو آگے بھجوا دیا گیا پھر جارج کی گاڑی کو جیپ کے ساتھ باندھ دیا گیا گاڑی میں جارج اور اس کی بیوی جوسیفر بیٹھے اور ہم لوگ اپنی جیپ میں اور جلدی سے کار کو ٹوچین کرتے ہوئے تھانہ روانہ ہوئے۔ اور گاؤں والوں کو خبر ہو جاتی تو وہ لوگ ہم لوگوں کو گھیر لیتے اور بھگتا کو نہیں لے جانے دیتے۔

تھانہ لاکر بھگتا سے پوچھ تاچھ کی گئی۔ تھرڈ ڈگری طریقہ استعمال کرنے پر اس نے ساری سچائی اگل دی بھگتا ہی ہر اندھیری رات کو شیر کا کھال پہن کر اور مکھوٹا لگا کر لوگوں کے دروازہ پر جاتا تھا۔ اگر گھر والا اس کے یہاں نذرانہ وغیرہ دے جاتا تھا تو ٹھیک ورنہ دوسری اندھیری رات کو اس کے گھر کے ایک آدمی کو بے ہوش کرنے والی دوا سونگھا کر لے آتا تھا۔ اور اسے جان سے مار دیتا تھا۔ تاکہ لوگ سمجھیں کہ شیر دیوتا ناراض ہو گئے ہیں۔ اگر کسی نے پیچھا کیا تو اس کا بھی خاتمہ کر دیتا تھا۔ اور اس طرح سیدھے سادے لوگوں کو وہ ٹھگتا رہا۔ یہ سب وہ اتنی چالاکی سے کرتا تھا کہ کسی کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ یہ کام بھگتا کا ہے لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ جارج جیسا مانا ہوا شکاری آرہا ہے تو اس کو اپنی جان کے ساتھ ساتھ بھید کھل جانے کا بھی خطرہ ہوا۔ اسی لئے وہ جارج کے آتے ہی اسی رات اس کے خیمہ میں

پرشیر کا بہانہ کر کے گیا کتے کو زہر ملا کر گوشت کا ٹکڑا دے دیا۔ کتا فوراً ہی ڈھیر ہو گیا۔ جارج کو شیر کے بہانے لے جا کر راستے میں اس کے منھ پر اچانک بے ہوشی کی دوا والا کپڑا رکھا۔ جب تک جارج سنبھلتا دوا اپنا کام کر چکی تھی وہ بیہوش ہو گیا اسے اپنی کٹیا میں لے جا کر اس نے قید کر دیا صرف ضروری حاجتوں کے لئے اندھیرے میں اس کے منھ میں کپڑا ٹھونس کر لے جاتا تاکہ وہ ہلا نہ کر سکے۔ کھانا دن رات میں ایک بار دیتا۔ جس سے وہ لاغر ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر جارج کو جان سے مار دیگا تو ہو سکتا ہے کہ پولس اسکے پیچھے پڑ جائے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جارج ایک اہم شخصیت ہے اس کا خیال تھا کہ اس کی بیوی اس سے رجوع کریگی تو وہ اس سے کافی روپیہ لے کر پوجا پاٹ کر اس کے شوہر کو لا دے گا۔ اسی لئے وہ سب کو کہہ رہا تھا کہ شیر دیوتا کو جارج مارنے آیا تھا تو دیوتا اس سے ناراض ہو کر اس کو آسمان پر اٹھا لیا ہے۔ لوگوں کو اس سے بھگتا کی بات پر اور اعتماد ہو گیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اگر جارج تمہارے قید سے تمہارے پوجا پاٹ کرنے کے بعد چھوٹتا تو وہ لوگوں کو سچائی نہیں بتاتا۔ اس پر بھگتا نے کہا کہ نہیں! میں نے جارج کو بتا رکھا تھا کہ اس کو دیوتا کے لوگ پکڑ کر لے جا رہے تھے تو میں نے دیوتا سے گہار کر کے اپنے پاس رکھا ہے دیوتا کے حکم سے اسے باندھ رکھا ہے دیوتا کا حکم نہ مالوں گا تو وہ ناراض ہو جائیں گے۔ ان کا پوجا پاٹ کر کے انہیں راضی کروں گا اور اگر وہ راضی ہو جائنگے تو اس کو چھوڑ دوں گا۔

جارج نے بھگتا کی باتوں کو سچ بتاتے ہوئے کہا کہ وہ اس طرح کی باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ مگر بھگتا نے یہ سب اس ڈرامائی انداز میں کیا کہ مجھے یقین کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ بھگتا جب خیمہ میں اسے بلانے گیا تھا تو بھی مکھوٹا لگائے ہوئے تھا۔

دوسرے روز جارج کی گاڑی بن گئی وہ اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ خوشی خوشی روانہ ہوا جارج اور جونیفر نے ہم لوگوں کا خاص طور پر میرا بڑا شکریہ ادا کیا۔

جونیفر نے کہا کہ آپکی وجہ کر میرے شوہر کو نئی زندگی ملی۔ آپ کا یہ احسان ہم لوگ زندگی بھر نہ بھولیں گے۔ میں نے کہا کہ یہ تو میرا انسانی فرض تھا بھگتا کو جیل بھیج دیا گیا بعد میں اسے قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ اور گاؤں کے لوگوں کو ہمیشہ کے لئے شیر دیوتا سے چھٹکارا مل گیا۔

———— ○ ————

مُرجھائی کلی

بینا کلاس میں اول آئی تھی۔ اب وہ میٹرک میں چلی گئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو اس کا چہرہ فخر اور خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ اس نے ماں کے ہاتھ میں رزلٹ رکھا تو وہ پھولوں نہ سمارہی تھی۔ ماں بھی رزلٹ دیکھ کر بڑی خوش ہوئی۔ اس کا چہرہ چوم لیا اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھکر بینا نے پوچھا ماں یہ آنسو کیوں؟ ماں بولی بیٹی یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ تمہارے پتا کی یاد آگئی وہ آج ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ باپ کا نام سن کر بینا بھی سست ہو گئی۔ اس کے والد کا انتقال اس کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ اسے باپ کا چہرہ تھوڑا تھوڑا یاد تھا۔ ماں کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے بینا نے کہا، ماں اب تو نئے درجہ کی کتابیں بھی خریدنی ہو گی۔ اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا؟ میٹرک کی کتابیں مہنگی ہوتی ہیں۔ ماں نے فکر مند ہوتے ہوئے بھی بیٹی کو دلاسا دیا۔ سب انتظام ہو جائے گا اتنے میں اس کے چچا گھر میں داخل ہوتے ہوئے بولے کیا بات ہے بھابی؟ آج بیٹی کا بڑا لاڈ ہو رہا ہے۔ بینا کی ماں ہنستے ہوئے بولیں۔ دیور جی تمہاری بھتیجی کلاس میں اول آئی ہے۔ اب میٹرک میں چلی گئی ہے۔ بینا کے چچا مادھو جی خوش ہوتے ہوئے بولے بینا کا بیٹھ ٹھونکنے لگے۔ بینا جھک کر ان کا پاؤں چھو رہی تھی۔ وہ بولے تب تو بیٹی کو انعام میں فراک ملنا چاہیے۔ بینا کی ماں بولی۔

دیور جی ! فراک کہاں سے ملے گا ابھی تو اس کی کتابیں خریدنے کے لیے ہی روپیہ جٹانا ہے
مادھو جی بولے بھابی آپ فکر نہ کریں کل میں شہر جا رہا ہوں بینا بیٹا تیار رہنا کل دس بجے صبح
میں شہر چلیں گے تمہاری کتابیں بھی دلوا دوں گا۔ اور انعام میں فراک بھی۔ بینا بہت خوش ہوئی

دوسرے روز صبح سویرے وہ تالاب پر نہانے گئی تا کہ جلد از جلد تیار ہو کر چچا
کے ساتھ شہر کتاب اور فراک لانے چلی جائے۔ وہ نہا کر کپڑا دھو رہی تھی کہ کیا دیکھتی ہے
کہ گاؤں کا آوارہ منش کرتار سنگھ سامنے کھڑا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر سہم گئی پھر بھی اپنا ڈر
چھپانے کے لیے اس نے کہا چاچا پرنام۔ کرتار زور سے غرایا۔ چپ میری چھمک چھلو، میں تمہارا
چچا کب سے ہو گیا۔ اور اس کا منھ ایک ہاتھ سے دباتے ہوئے کندھے پر اٹھا کر نزدیک کی
جھاڑی میں لے گیا۔ کچھ عورتیں جو برتن دھو رہی تھیں ان کی ہمت کرتار سے لڑنے کی نہیں تھی۔
دوڑ کر گاؤں میں خبر کرنے چلی گئیں۔ جب گاؤں کے لوگ اور بینا کی ماں پہونچی تو دیکھا کہ بینا
مردہ ہے۔ کرتار اس کے ساتھ منھ کالا کر کے اس کی گردن دبا کر اسے ختم کر دیا اور خود غائب
ہو گیا ہے۔ پولس کو خبر ہوئی مگر پولس نے کرتار کے نام سے کیس کرنے سے انکار کر دیا۔
کیونکہ کرتار پولس کا آدمی تھا گاؤں والوں نے پولس کو لاش نہیں لے جانے دیا۔
ان لوگوں کا کہنا تھا کہ جب تک کرتار کو گرفتار نہیں کیا جائے گا وہ لوگ لاش کو نہیں
لے جانے دیں گے۔

بینا کا چچا جب تیار ہو کر بینا کے گھر اس کو لے کر شہر جانے کے لیے گیا۔
تو دیکھا سناٹا ہے، گھر میں کوئی نہیں ہے۔ پڑوس کے لوگوں نے بتایا کہ بینا کے ساتھ کیا
واقعہ ہوا ہے۔ مادھو دوڑ کر گیا تو دیکھا کہ کلی پھول بننے کے پہلے مرجھا چکی ہے۔ درندہ صفت
کرتار نے اس کی بھتیجی کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔
وہ وہاں سے بھاگتا ہوا اپنے گھر گیا بندوق لی اور سیدھے کرتار کے گھر گیا اس کی جوان
بیٹی کو بندوق دکھا کر اپنے ساتھ لے آیا۔ گھوڑے پر اسے بٹھا کر کرتار کو تلاش کرنے لگا۔

آخر کرتار اسے ایک کھلیان میں چھپا مل گیا کرتار نے اپنی بیٹی کو جب مادھو کے ساتھ دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔ مادھو نے کرتار کو للکارتے ہوئے کہا کرتار دیکھ! میں تیری بیٹی بٹھا کر لے آیا ہوں تیرے سامنے ہی اس کے ساتھ برائی کروں گا۔ اور پھر اسے مار ڈالوں گا۔ کرتار نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا مادھو وہ تیری بیٹی سمان ہے اسے چھوڑ دے۔ مادھو نے چلاتے ہوئے کہا کرتار ببیا تیری بیٹی سمان نہیں تھی۔ تو نے اس کے ساتھ کیا کیا؟۔ اب اپنی بیٹی پر پڑا ہے تو کیسا الگ رہا ہے؟ میں نہیں چھوڑوں گا تیری بیٹی کو۔ جو کچھ تو نے میری بیٹی کے ساتھ کیا ہے وہی میں تیری بیٹی کے ساتھ کروں گا۔ کرتار مادھو کا پاؤں پکڑ لیتا ہے۔ مادھو اسے لات مارتے ہوئے کہتا ہے اٹھ اے حیوان! اپنی بیٹی کی عزت پر آیا ہے تو کیسا بھیگی بلی بنا ہے۔ دوسرے کی بیٹی کے ساتھ وہی فعل کیا تو تجھے شرم نہیں آئی۔ کرتار ہاتھ جوڑ کر بولا۔ غلطی ہوئی معاف کر دے۔ مادھو اب ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ مادھو نے کہا حرامزادے کیا تجھے معاف کر دینے سے میری معصوم ببیا واپس آجائے گی۔ اتنے میں مادھو دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ چلے آرہے ہیں نزدیک آنے پر معلوم ہوا کہ ایس، پی صاحب فورس کے ساتھ ہیں اور پیچھے پیچھے گاؤں کے لوگ۔ ایس، پی صاحب مادھو سے کہتے ہیں کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں مت لو اور کرتار کو گرفتار کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ کرتار گھگھیاتا ہے۔ ایس، پی صاحب میری بچی کو بچا لیجیے۔ مادھو کہتا ہے ایس، پی صاحب! میں کرتار کے ایسا گرا ہوا آدمی نہیں ہوں۔ اس معصوم بچی کا بال بھی بیکا نہ کروں گا۔ میں تو کرتار کو گرفتار کرا کر قانون کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ داروغہ جی کرتار سے ملے ہوئے ہیں وہ میری بھتیجی کے قاتل پر مقدمہ بھی چلانا نہیں چاہتے ہیں گرفتاری تو دور کی رہی۔ ایس، پی صاحب نے مادھو سے کہا اطمینان رکھو میں نے داروغہ کو معطل کر دیا ہے۔ کرتار تمہاری مدد سے گرفتار ہو چکا ہے اب اس پر مقدمہ بھی چلے گا اور اس کو سزا بھی ہوگی۔ ایس، پی صاحب کرتار کو ہتھکڑی پہنا کر تھانہ لے چلنے کو کہتے ہیں۔

——— ۰ ———

افسانچے

حادثہ

(الف)

کافی دن سے گھر سے کوئی خط نہیں آرہا تھا فون کا لائن نہیں تھا۔ شعیب نے بے چین ہو کر ایک دن کی فرصت میں لیکر بس میں سوار ہو کر گھر روانہ ہو گئے۔ گھر پر شعیب کی خیریت بہت دنوں سے نہیں ملی تھی تو اس کی بیوی نفیسہ پریشان ہو کر شعیب سے ملنے بس سے چل پڑی۔ شعیب کی بس مشکل سے دس پندرہ کلومیٹر ہی گئی ہو گی کہ سامنے سے آتی ہوئی بس سے اس کی ٹکر ہو گئی اس حادثہ میں شعیب کی موت جائے وقوعہ ہی پر ہو گئی دوسری جانب سے آنے والی بس میں نفیسہ سوار تھی اس کی بھی موت وہیں پر ہو گئی۔ بعد میں دونوں کی میت گھر لے جائی گئی۔ یہ حادثہ آخری ملاقات بن گئی۔

(ب)

سہیل کا انٹرویو تھا جلدی جلدی اسٹیشن پہونچا۔ ٹرین میں جگہ مل گئی۔ کچھ ہی دور گاڑی گئی ہو گی کہ اچانک ڈبے میں آگ لگ گئی۔ زنجیر کھینچی گئی۔ گاڑی رکتے ہی بھگدڑ مچ گئی۔ کوئی کھڑکی سے کودنے لگا تو کوئی لوگوں کے سر پر چڑھ کر باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ گیٹ جام ہو گیا۔ نوجوان تو کسی طرح نکل پڑے ایک ادھیڑ عمر شخص دھکے کھا کر گر پڑا ممکن تھا کہ لوگ اس کو روند ڈالتے۔ مگر سہیل دوڑ کر گیا،

اور انہیں سہارا دے کر بھیڑ کو چیرتا ہوا باہر نکلا۔ آگ بجھائی گئی گاڑی پھر اپنی منزل کی طرف گامزن ہوئی۔ سہیل نے اس بزرگ کو سہارا دے کر پھر سے ڈبے میں بٹھایا، پانی پلایا۔ انہوں نے سہیل کو دعائیں دیں۔ پھر پوچھا کیا کرتے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ تو سہیل نے اپنے سفر کا مقصد بتایا۔ بزرگ اسی انٹرویو کو لینے جا رہے ہیں پھر کیا تھا، انٹرویو ہوا اور سہیل اس جاب کے لیے چن لیا گیا۔ یہ حادثہ سہیل کیلئے نیک فال ثابت ہوا۔

(ج)

نیلم کی شادی حال ہی میں ہوئی تھی۔ اس کی خواہش کے خلاف اس کی شادی اس کے والدین نے راجن سے کر دی تھی۔ نیلم سدھیر سے پیار کرتی تھی۔ شادی کے بعد بھی اس سے ملنے کے لئے بے چین تھی۔ اس نے راجن سے بہانہ کیا کہ وہ میکا جانا چاہتی ہے طبیعت بہت گھبرا رہی ہے۔ راجن نے دلاسا دیا کہ فرصت ملتے ہی چلیں گے۔ لیکن نیلم مچل گئی کہ میں بس ایک دو روز میں جا کر چلی آؤں گی۔ مجبوراً راجن نے نیلم کے لئے ہوائی جہاز میں سیٹ ریزرو کرا دیا۔ ہوائی اڈہ جا کر اسے چھوڑ آیا۔ جب جہاز اڑا تو اس نے اپنے آگے، پیچھے دیکھا تو سدھیر ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہے۔ بڑا گھلا ملا بات چیت کر رہا ہے۔ نیلم نے سدھیر کے پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف مخاطب کیا تو وہ چونک کر مڑا، نیلم کو دیکھ کر ہیلو کہا اور خیریت پوچھی۔ پھر ساتھ والی لڑکی سے تعارف کراتے ہوئے کہا نیلما دیکھو یہ مسز نیلم راجن ہیں اور نیلم کو بتایا کہ یہ مس نیلما ہیں اور جلد ہی مسز نیلما سدھیر بننے والی ہیں۔ نیلم کا چہرہ اتر گیا۔ ہوائی اڈہ پر اترتے ہی) اگلی فلائٹ سے واپس راجن کے پاس پہونچ گئی۔ گھر پہونچکر راجن کو بتایا کہ اس کے بغیر طبیعت نہیں لگی سو واپس چلی آئی اور اس طرح ایک زبردست حادثہ ہونے سے رہ گیا۔

(د)

سلیم تیزی سے پیدل ہی دفتر کی جانب جارہا تھا۔ کل اس کی سائیکل چوری ہو گئی تھی۔ اچانک سامنے سے آتی ہوئی سائیکل سے وہ ٹکرا گیا اور سائیکل سوار گر پڑا۔ وہ اٹھتے ہوئے سلیم پر بگڑا۔ سامنے دیکھ کر نہیں چلتے۔ سلیم نے افسوس کرتے ہوئے سائیکل پر نظر ڈالی تو وہ اس کی چوری شدہ سائیکل تھی۔ اس نے سائیکل اور سائیکل سوار دونوں کو پکڑ لیا اور تھانے لے گیا۔ اس کی سائیکل اسے واپس مل گئی۔ سائیکل لے کر دفتر پہونچا تو رفیق کاروں نے اس حادثہ کی مبارکباد پیش کی۔

(ہ)

شکیل کو موٹر سائیکل تیز چلانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ اپنی عادت کے مطابق ایک دن بھیڑ والی سڑک پر تیزی سے موٹر سائیکل چلاتا ہوا جارہا تھا کہ آگے جاتی ہوئی لڑکی کو ٹکر لگی۔ وہ گر پڑی اور بریک لیتے لیتے بھی موٹر سائیکل کا ایک حصہ اس کے پاؤں پر چڑھ گیا۔ بہت علاج کے بعد بھی وہ ایک پاؤں کی لنگڑی رہ گئی۔ شکیل برابر اس کو دیکھنے جاتا تھا۔ جب اس کا پاؤں ٹھیک نہیں ہوا تو اس کی ماں نے شکیل سے کہا کہ ہم لوگ پہلے ہی اس کی شادی کے لئے پریشان تھے۔ کوئی لڑکا نہیں مل رہا تھا۔ اب کون بھلا اس سے شادی کرے گا۔ شکیل نے کہا۔ ماں جی! میں شادی کروں گا۔ اور دونوں کی شادی ہو گئی۔ اور یہ حادثہ دونوں کی زندگی کا سنگ میل بن گیا۔

—— ۰۔۰ ——

چور

(الف)

مہندر کا آخری وقت تھا۔ اس کی بیوی، بیٹی اور پڑوس کے دو چار آدمی اس کے نزدیک جمع تھے۔ وہ بار بار سریش سریش بول رہا تھا۔ سریش اس کے دوست کا لڑکا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اسی نے اس کو پالا تھا۔ دل ہی دل میں یہ سوچا تھا کہ اسی سے اپنی بیٹی ریتا کی شادی کر دے گا۔ مگر جب سریش پڑھ لکھ گیا تو گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ مہندر کی بیوی باہر کمرہ میں گنگا جل لانے گئی تو دیکھا کہ سریش کھڑا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر روتے ہوئے بولی کہ مہندر تمہیں ہی یاد کر رہا ہے۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے مہندر کے پاس لے آئی۔ اور بولی کہ لو سریش آگیا۔ اس نے اپنے پڑوسی سے کہا کہ پنڈت بلائے وہ ابھی ریتا اور سریش کی شادی کرائے گا۔ سریش کچھ بولنا چاہتا تھا مگر مہندر نے اسے چپ کرا دیا۔ پنڈت آئے، دونوں کی شادی ہوئی اور اس کے بعد مہندر مر گیا۔ بعد میں ریتا کے شوہر نے بتایا کہ وہ سریش نہیں ہیں بلکہ بی اے پاس ہے۔ بیکاری سے تنگ آکر چوری کرنے کے لئے اس کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ مگر سریش سمجھ کر ماں نے پکڑ لیا۔ اور اسے شادی کرنی پڑی۔ وہ پکڑے جانے کے ڈر سے چپ رہا اور شادی کر لی۔

(ب)

لتا صبح سویرے شوہر کو تیار دیکھ بولی کہ اتنا سویرے سویرے کہاں جا رہے ہو؟ شوہر بولا کہ جا نہیں آرہا ہوں۔ اس نے تعجب سے کہا کہ تو پھر رات کون آیا تھا؟۔

اور کون تمہاری جگہ سویا تھا؟ وہ ہڑبڑا کر اٹھی تو پتہ چلا کہ لتا شوہر کا انتظار کرتے کرتے دروازہ کھلا چھوڑ کر سو گئی تھی رات میں چور آیا تھا۔ رات میں سویا بھی اور صبح ہونے کے پہلے کمرا میں موجود قیمتی سامان لے کر رفو چکر ہو گیا۔

(ج)

ایک چور ایک جھونپڑی میں چوری کرنے کے لئے داخل ہوا سارے گھر میں تلاش کر گیا کوئی سامان نہ ملا۔ واپس ہوتے وقت دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص ایک کونے میں بیٹھا تھر تھر کانپ رہا ہے اس شخص نے بوڑھے سے پوچھا کانپ کیوں رہے ہو؟ بوڑھا بولا اوڑھنا نہیں ہے جاڑے سے کانپ رہا ہوں؟ چور نے اپنی چادر اتار کو بوڑھے کو دیتے ہوئے بولا لو اوڑھ لو اور بڑبڑاتے ہوئے چلا گیا چوری کرنے آیا اور لٹ کر جا رہا ہوں۔

(د)

ایک چور ایک نائی کے جھونپڑے میں داخل ہوا۔ گھر میں سوائے استرے کے کچھ نہ ملا۔ اسی کو لے کر چل دیا۔ نائی جاگ اٹھا اس نے دیکھا کہ چور استرے لے کر جا رہا ہے اس نے سوچا شاید کوئی نائی ہے برش اور صابن چھپر میں گھسایا تھا اور قینچی و کنگھا اس کے پاکٹ میں تھا وہ ان چاروں چیزوں کو لے کر بھی چور کے پاس گیا اور بولا بھائی صرف استرے سے کیسے کام کرو گے؟ ان چیزوں کو بھی لیتے جاؤ۔ چور نے شرمندہ ہو کر استرہ رکھ دیا اور چلتا بنا۔

(ہ)

ایک چور نیا نیا گروہ میں شامل ہوا۔ پہلے ہی دن اپنے ساتھیوں کے ساتھ چوری کرنے ایک گاؤں میں گیا جیسے ہی ایک گھر کے پچھواڑے سے اندر کودا آواز پر گھر میں سوئے آدمی کی نیند ٹوٹ گئی اس نے پہچانتے ہوئے کہا آپ ادھر سے کود کر کیوں داخل ہوئے؟ اتنی رات کو کہاں سے آرہے ہیں؟ چور نے شرمندہ ہوتے ہوئے سسر کا پیر چھوتے ہوئے کہا پرنام! ٹرین لیٹ ہو گئی تھی۔ آواز دینے پر کسی نے نہیں سنا۔ سو ادھر سے کود کر اندر داخل ہو گیا۔

شادی

(الف)

صمد کو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی تھی۔ جس لڑکی کو دیکھتا اس میں کوئی نہ کوئی خامی ہی نظر آتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی عمر چالیس سال سے تجاوز کر گئی آخر ش اسے ایک لڑکی پسند آئی مگر افسوس اس لڑکی نے ہی صمد کو نا پسند کر دیا۔ اسی دوران اس کے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا اس کی بھابی لاولد تھیں۔ خاندان والوں نے اسی سے شادی کرادی۔ مگر صمد نے اس شادی میں ایک شرط رکھ دی کہ اگر تین سال تک بچہ نہ ہوا تو وہ دوسری شادی کرے گا مگر قسمت کا کھیل دیکھئے اگلے ہی سال جڑواں بچہ پیدا ہوا۔

(ب)

معید کی بیوی کو لو لڑکیاں ہو گئیں مگر لڑکا نہ ہوا آخر اس نے دوسری شادی کر لی۔ اس سے بھی لو لڑکیاں ہوئیں مگر لڑکا پھر بھی نہیں ہوا۔ پھر اس نے تیسری شادی کی، اس سے بھی ایک لڑکی ہوئی اب عمر ڈھل رہی تھی مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور چوتھی شادی کر ڈالی اس بھی ایک لڑکی ہوئی اور اس کے بعد وہ خود اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

(ج)

ریاض کی شادی کو دس سال بیت چکا تھا۔ مگر اس کی بیوی کی گود نہیں بھری تھی۔ نا امید ہو کر اس نے دوسری شادی کی۔ مگر پانچ سال تک دوسری بیوی کا

بھی پار س بھاری نہیں ہوا۔ اب وہ تیسری شادی کی سوچ رہا تھا کہ پہلی بیوی امید سے ہو گئی۔ خدا نے اسے بیٹا عطا کیا۔

(۷)

ثریا کی شادی کے لئے بہت دوڑ دھوپ کے بعد لڑکا ملا۔ شادی کی تاریخ طئے ہوئی۔ بڑی دھوم دھام سے بارات پہونچی۔ مگر جب ور مالا پہنانے کا وقت آیا تو ثریا نے انکار کر دیا اسے لڑکا پسند نہ تھا۔ باپ کی بڑی شرمندگی ہوئی۔ مگر ثریا کی چھوٹی بہن رینا نے باپ کی عزت کو نیلام ہونے سے بچا لیا۔ اور وہ شادی کے لئے رضامند ہو گئی۔ اس منڈپ پر اس کی شادی انجام پا گئی اور ڈولی میں بیٹھکر وہ سسرال چلی گئی۔

(۸)

نلنی کی شادی بڑی مشکل سے طئے ہوئی بارات جب پہونچی تو دلہانے بنا موٹر سائیکل کے شادی سے انکار کر دیا۔ بڑی مشکل سے موٹر سائیکل کی رقم جٹا کر دلہا کو شادی کے لئے راضی کیا گیا۔ مگر اب نلنی نے ور مالا پہنانے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ جب ابھی سے یہ رویّہ ہے تو شادی کے بعد کیا ہوگا؟ اس لئے وہ ایسے آدمی سے شادی نہیں کرے گی۔ مجبوراً بارات لوٹ گئی۔ شادی میں آئے ایک لڑکے جتین نے بنا تلک کے شادی کرنے کی رضامندی ظاہر کی۔ نلنی بھی راضی ہو گئی۔ خوشی خوشی بیاہ کر جتین کے ساتھ سسرال چلی گئی۔

بھائی

(الف)

دو بھائی کمانے چلے۔ دن بھر کام کرنے کے بعد شام میں انہیں دس دس روپے مزدوری ملی۔ چھوٹے بھائی نے اپنی مزدوری کی رقم دس روپیہ بڑے بھائی کو رکھنے کو دے دی تاکہ گھر پہنچ کر وہ لے لیگا۔ گھر پہونچنے کے بعد چھوٹے بھائی نے اپنی رقم مانگی تو بڑے بھائی نے بتایا کہ اس کا نوٹ راستہ میں ہی کہیں پاکٹ سے گر گیا ہے۔ چھوٹے بھائی نے پوچھا، بھیا آپ کا نوٹ کہاں ہے؟ بڑے بھائی نے جواب دیا کہ دونوں نوٹ ایک ساتھ جیب میں رکھی تھی مگر ایک نوٹ گر گیا۔

(ب)

باپ کے مرنے کے بعد دو بھائیوں کے درمیان جائیداد کا بٹوارہ ہونے لگا گھر آدھا آدھا تقسیم ہوا۔ اس کے بعد ایک گائے کا بٹوارہ ہونا تھا تو بڑے بھائی نے کہا گائے میں رکھوں گا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں انہیں دودھ پینے کی کام آئیگی۔ چھوٹے بھائی نے چپ چاپ مان لیا۔ پھر سائیکل کی باری آئی اس کے بعد گھڑی کا بٹوارہ ہوا۔ پنچوں نے پوچھا کون کیا لے گا؟ دونوں ہی بار بڑا بھائی بول پڑا میں رکھوں گا۔ چھوٹا بھائی خاموش رہا۔ آخر میں باپ کے قرض کا بٹوارہ ہونا تھا کون کتنا ادا کرے گا۔ پانچ سو روپیہ کی رقم مہاجن کو واجب الادا تھی۔ پنچ نے پوچھا کہ کون کتنا قرض ادا کریگا

بڑے بھائی نے سنتے ہی چھوٹے بھائی سے کہا اتنی دیر سے میں بول رہا ہوں اور ہر بار تم چپ رہے ایک بار بھی تو بولو کہ میں رکھوں گا۔

(ج)

اسلم اور اکرم دو جڑواں بھائی تھے، دونوں ہم شکل تھے۔ اسلم کی شادی طئے ہوئی مگر لین دین کے لیکر معاملہ گڑبڑ ہو گیا اور بارات نہیں آئی معاملہ پولس کچہری تک گیا۔ اسلم باہر نوکری پر تھا۔ فرصت لے کر آیا تھا لہٰذا لوٹ گیا پولس نے اکرم کو اسلم سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ پولس کپتان سدھار وادی طبعیت کے تھے انہوں نے اکرم کے لاکھ عذر کرنے کے باوجود کہ وہ اسلم نہیں ہے اس کی شادی اسلم سمجھ کر طئے شدہ جگہ پر کرا دی۔ اکرم کی بیوی والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ شادی کے بعد سچائی کا پتہ چلا۔ اکرم گھر جوائی بنکر سسر کا کاروبار سنبھالنے لگا۔ اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگا۔

(د)

دو بھائی تھے اظہر اور مظہر۔ اظہر کافی تیز طرار تھا۔ جبکہ مظہر سیدھا سادا بے وقوف تھا۔ دونوں کام کرنے نکلے۔ اظہر نے کہا آج جو مزدوری ملے گی اس میں اوپر کا میں لوں گا اور نیچے کا تم۔ جب شام کو مزدوری میں ایک بوجھا سرسوں کا ملا۔ تو معاہدہ کے مطابق اوپر کا اظہر نے لیا اور نیچے کا مظہر نے۔ اس طرح اظہر کے حصے میں سرسوں کا دانہ آیا اور مظہر کو صرف ڈنٹھل پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ دوسرے دن مظہر نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ آج جو مزدوری ملے گی اس میں اوپر کا میں لونگا اور نیچے کا تم۔ شام میں انہیں مونگ پھلی کا ایک بوجھا ملا۔ جس کے اوپر کا پتہ مظہر کو ملا اور نیچے کا پھل اظہر کو مل گیا۔

(۵)

نعیم اور فہیم دو بھائی تھے۔ بڑا بھائی نعیم بڑا لالچی اور بے ایمان انسان تھا جبکہ چھوٹا بھائی فہیم ایک رحم دل اور خدا ترس آدمی تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد نعیم نے چھوٹے بھائی فہیم کو جائیداد میں کوئی حصہ نہیں دیا۔ الٹا حصہ مانگنے پر کافی لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو گیا۔ فہیم کو بری طرح مارا پیٹا یہاں تک کہ سلاخ سے اس کی آنکھیں بھی پھوڑ دیتا مگر گاؤں والوں کے بیچ بچاؤ سے اس کی بینائی بچ گئی۔ مایوس ہو کر وہ پردیس کمانے چلا گیا اپنی محنت اور ایمانداری سے وہ ایک بڑا آدمی بن گیا اور نہایت عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگا۔

بڑے بھائی نعیم کی دونوں آنکھیں ایک سڑک حادثہ میں جاتی رہیں۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اگر کوئی اپنی ایک آنکھ عطیہ کر دے تو اسے روشنی پھر واپس مل سکتی ہے مگر بیوی، بیٹا، بیٹی کوئی بھی اپنی ایک آنکھ دینے پر راضی نہ ہوا۔ لاچار ہو کر وہ گھر بیٹھ گیا۔ فہیم جب بہت دنوں بعد گھر آیا تو اسے اپنے بڑے بھائی پر بڑا ترس آیا اور اس کی رحمدلی عود آئی۔ اس نے اپنی ایک آنکھ اپنے بڑے بھائی کو عطا کر کے اسے بینائی واپس دلا دی۔

—— ۲۰ ——

کتاب ملنے کا پتہ

مظفر پور

اعجازی ہاؤس، ڈاکٹر اعجازی مارگ، مظفر پور فون نمبر ۲۴۷۰۹۹

گیا

مکتبہ آدرش، آبگلہ پوسٹ بنیاد گنج، گیا (بہار)

پٹنہ

سراج الحق کیمپس، محمد پور، شاہ گنج، مہندرو، پٹنہ فون نمبر ۲۶۸۰۱۴۹

مُصنف کی دیگر تصنیف

وسیلہ

(کہانیوں کا مجموعہ)

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اترپردیش لکھنؤ کی مالی تعاون سے شائع شدہ۔

ھدیہ : پچیس روپے

وسیلہ

"ڈاکٹر منصور احمد اعجازی نے اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے ذریعہ دورِ حاضر کے انسانی معاشرہ کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے ان کی بامقصد اور دل کو چھو لینے والی کہانیوں کا مجموعہ "وسیلہ"، مضامین اور پلاٹ کے لحاظ سے ایک قابلِ قدر کاوش ہے۔"

ہفت روزہ نئی دنیا، نئی دہلی، یکم مئی ۱۹۹۵ء

"وسیلہ" کے متعلق

دانشوروں کی رائے

"آپ کی کتاب سے کہانی لکھنے کی صلاحیت اجاگر ہوتی ہے"

——— اخلاق الرحمٰن قدوائی

"آپ کی کہانیوں کا مجموعہ نظر نواز ہوا۔ شکریہ! آنکھوں کی تکلیف میں افاقہ ہوتے ہی ان کا مطالعہ کروں گا"

——— خوشونت سنگھ

"ڈاکٹر اعجازی نے کہانیوں کے ذریعہ زندگی کی تلخ حقیقتوں پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور دکھی انسانیت کو محبت، خلوص، مساوات، اتحاد، بھائی چارگی بلند حوصلگی کا درس دیا ہے۔ صنف افسانہ پر آپ کو کامل دسترس حاصل ہے"

——— معین شاہد